صفحات ۴۰۰ مجلد مع گرد پوش، قیمت تیس روپیے، پتہ: جامعہ سراج العلوم السلفیہ، جھنڈا نگر (نیپال)۔

خلفائے راشدینؓ کی حکومت بے مثال تھی، اس کتاب میں انکے سراپا خیر و برکت دور کے امن و امان، خوشحالی، فارغ البالی اور عدل و انصاف کی جھلک دکھائی گئی ہے، اور انکی رعایا پروری اور خلق خدا کی خدمت اور نفع رسانی کے واقعات قلمبند کئے گئے ہیں، سب سے پہلے مصنف نے خلفائے راشدین کی امانت و دیانت کا تذکرہ کیا ہے اور قوم کے مال میں انکی احتیاط اور کسی قسم کی خیانت اور خورد برد کرنے کے متعدد حیرت انگیز واقعات تحریر کئے ہیں، ان کی سادہ اور درویشانہ زندگی کے سلسلہ میں طعام، لباس اور رہن سہن وغیرہ میں انکی سادگی اور قناعت پسندی دکھائی ہے اور عام لوگوں کے ساتھ انکے حسن سلوک اور مساویانہ برتاؤ کی تفصیل بھی پیش کی ہے، اور زمین کی آباد کاری اور رفاہ عام کے مختلف کاموں کے علاوہ مسکینوں، یتیموں، بیوہ عورتوں اور بے سہارا لوگوں نیز غیر مسلموں اور ذمیوں کے ساتھ اچھے سلوک کا حال بیان کیا ہے، افلاس اور بے روزگاری کے خاتمہ اور سماجی و معاشی ناہمواری کو درست کرنے کے لئے انکی تدبیروں اور کوششوں کا ذکر ہے، عہدوں پر مناسب اور باصلاحیت لوگوں کے تقرر اور عمال کی نگرانی و احتساب اور ان کے خلاف داد رسی وغیرہ کے واقعات بھی پیش کئے ہیں، اس کتاب میں حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے دور کے واقعات بکثرت بیان کئے گئے ہیں، دوسرے خلفائے راشدینؓ کے علاوہ کہیں کہیں بعض عباسی خلفا کی رعایا پروری اور انصاف پسندی کا ذکر بھی آگیا ہے، اور جن پہلوؤں پر بحث کی ہے، انکے متعلق پہلے اسلام کی عام ہدایات اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات بھی پیش کی ہیں، اس کے بعد خلفائے راشدینؓ کی زندگی سے اس کی مثالیں اور عملی نمونے دئے ہیں اور ضمناً ان امور کے بارہ میں موجودہ دور کی حکومتوں کے غلط رویے کا بھی کہیں کہیں ذکر کیا گیا ہے، اردو میں خلفائے راشدینؓ کے حالات اور اسلامی نظام پر متعدد کتابیں لکھی جا چکی ہیں، اس کتاب میں خلفائے راشدینؓ کی رعایا پروری اور انکے فلاحی کاموں کو یکجا کر دیا گیا ہے، زبان و بیان کی خامی کا اعتراف مصنف کو خود ہے، اسکے علاوہ اس میں ربط و تسلسل کی کمی اور ناہمواری بھی ہے، مختلف مباحث ایک دوسرے سے مختلط ہو گئے ہیں، تحریر میں الجھاؤ اور پھیلاؤ بھی ہے، کہیں کہیں حوالے درج نہیں ہیں، اور بعض کم درجہ کے حوالے بھی درج ہیں۔

"ض"

جلد ۱۳۵، ماہ جمادی الاخری ۱۴۰۵ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۸۵ء عدد ۳

مضامین

شذرات

مقالات

سلسلہ اسلام اور مستشرقین

جلد اول

دار المصنفین میں اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر جو نیا سلسلہ شروع کیا گیا ہے، اسکی پہلی جلد مرتب اور چھپ گئی ہے، یہ فروری ۸۲ء میں اس موضوع پر جو سمینار ہوا تھا، اسکی بہت ہی مفصل اور دلچسپ روداد ہے۔

"منیجر"

شذرات

۱۶؍ر ۱۷؍ر فروری ۱۹۸۵ء کو کلکتہ کی مولانا محمد علی جوہر لائبریری کے زیرِ اہتمام مولانا محمد علی جوہرؒ پر ایک باوقار سمینار بہت ہی خوش اسلوبی سے انجام پایا۔

یہ لائبریری کلکتہ کے مسلمانوں کی خاص توجہ اور دلچسپی کا مرکز بنی ہوئی ہے، اس کے صدر پروفیسر نور الحسن ہیں لیکن اس کی روح اس کے سکریٹری جناب خلیل احمد صاحب ہیں، جو اپنی خاموش، بے لوث اور سرگرم خدمات کی وجہ سے بہت مقبول ہیں، ان ہی کی کوششوں سے یہ سمینار منعقد ہوا، جس کو کامیاب بنانے میں جناب حکیم مولانا محمد زماں صاحب کے صاحبزادے جناب حکیم محمد عرفان حسینی سمینار کمیٹی کے کنوینر کی حیثیت سے برابر اپنی محنت پر سوار رہے، ان کے والد بزرگوار ان کی رہنمائی کرتے رہے، جن کی مقدس، باوزن اور مقناطیسی شخصیت ہر کام کو کامیابی سے ہمکنار کرنے میں پوری ضامن ہوتی ہے، اس سمینار کمیٹی کے صدر جناب محمد عبد المجید تھے جو ضابطہ کی پابندی اور اپنے اخلاص کی فراوانی کیلئے کلکتہ میں مشہور ہیں۔

اس کا افتتاحی اجلاس بکر ہال میں حاضرین کے ایک اچھے مجمع میں ہوا، کلکتہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر خاص طور پر اس میں مدعو تھے، خصوصی مہمان علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب سید حامد صاحب تھے جنھوں نے کلکتہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو خاص طور سے مخاطب کر کے کہا کہ ہندوستان کے مسلمان اپنے ملک میں مسلمان بن کر محنت کر کے اور اپنے ہندو ہم وطنوں سے خوشگوار تعلقات قائم کر کے رہنا چاہتے ہیں، اس کھلے اجلاس کی صدارت ملک کے مایۂ ناز مورخ، اسلامی تصوف کے عاشق زار اور قلم کے شہباز جناب پروفیسر خلیق احمد نظامی نے کی، ان کے خطبہ کے اسلوب کی تاثیر نفس مضمون کی افادیت اور مولانا محمد علیؒ کی یادوں کے مشعل کو روشن کرنے کی خاطر ہم اس کو معارف کے زیر نظر شمارہ میں شایع کر رہے ہیں، امید کہ ناظرین اس کو پڑھ کر اپنے جذبات و احساسات کے مرواریدکو جھلملاتے پائیں گے، اس کھلے اجلاس کو جناب مولانا حکیم محمد زماں، پروفیسر صلاح الدین (ڈھاکہ یونیورسٹی) اور ڈاکٹر قمر الدین (کلکتہ یونیورسٹی) نے بھی مخاطب کیا، اس اجلاس کی نظامت کلکتہ کے مشہور ایڈوکیٹ خواجہ محمد یوسف صاحب نے اپنی شیوہ بیانی سے کی۔

سمینار کا دوسرا اجلاس اس خاکسار کی صدارت میں کھلے اجلاس کے بعد ہی ہوا، اس میں پہلا مقالہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے

جناب عبد اللطیف اعظمی کا تھا، وہ رسالہ جامعہ کے تین مولانا محمد علی جوہر نمبر نکال چکے ہیں، اسلیے وہ ہندوستان کے اس قائد کے مستند ماخذ بنے ہوئے ہیں، دوسرا مقالہ دار المصنفین کے رفیق مولوی ضیاء الدین اصلاحی نے مولانا محمد علیؒ کی شاعری کے عنوان سے پڑھا، جو بہت ہی سیر حاصل اور جامع تھا، تیسرا مقالہ دار المصنفین کے مولوی ابو البقاء ندوی کا مولانا محمد علی کے ایمان و ایقان کے عنوان سے تھا، چوتھا کلکتہ کے مشہور اخبار روزنامہ آزاد ہند کے کہنہ مشق، پختہ خیال اور باہمت اڈیٹر جناب احمد سعید ملیح آبادی کا تھا، جس میں مولانا محمد علی جوہرؒ کی صحافت نگاری کا تجزیہ کیا گیا تھا۔

دوسرے دن کی نشست پروفیسر خلیق احمد نظامی کی صدارت میں شلپا ہال میں ہوئی، اس میں پہلا مقالہ خاکسار کا "ہم مولانا محمد علی جوہرؒ سے کیا سیکھ سکتے ہیں" کے عنوان سے تھا، اس کا لب لباب یہ تھا کہ ہندوستان کے موجودہ دور کے مسلمان مولانا محمد علیؒ ہی کی طرح سچے مسلمان اور سچے وطن دوست بن کر رہنا چاہتے ہیں، وہ مولانا محمد علیؒ کی طرح اپنی مذہبی اور تمدنی ہستی کو کسی حال میں چھوڑنا پسند نہیں کریں گے۔

یہ مقالہ ختم ہوا تو خواجہ محمد یوسف صاحب نے رابندر ناتھ ٹیگور کا حوالہ دے کر جو سوال کیا اس کا مطلب یہ تھا کہ کیا مسلمان نیشنلزم اور پیٹریوٹزم کے معیار پر پورے اترتے ہیں؟ روزنامہ ہند اخبار کے اڈیٹر جناب شمس الدین فریدی کے سوال کا لب لباب یہ تھا کہ کیا ایک ملک میں مختلف مذاہب کی گنجایش ہو سکتی ہے؟ ان سوالات کے جواب میں خاکسار نے یہ عرض کیا کہ اگر یہ معیار ہو کہ ہندوؤں کی اکثریت جو کچھ کہے وہ تو نیشنلزم ہے اور مسلمانوں کی اکثریت جو کچھ کہے وہ کمیونلزم ہے تو نیشنلزم کے اس معیار پر مسلمان پورے نہیں اتر سکتے، اسی طرح کہا جاتا ہے کہ مسلمان اپنے دلوں پر ہاتھ رکھ کر خود سے پوچھیں کہ وہ ہندوستان کے وفادار ہیں کہ نہیں، تو ان کہنے والوں کے لیے جواب یہ ہے کہ ہندو اپنے دلوں پر ہاتھ رکھ کر پوچھیں کہ وہ مسلمانوں کو اپنا سمجھتے ہیں کہ نہیں، اگر سچے دل سے وہ مسلمانوں کو اپنا سمجھیں تو بقول مولانا محمد علیؒ مسلمان نہ صرف نیشنلسٹ بلکہ سوپر نیشنلسٹ بن کر اس ملک کی خدمت کریں گے، رہا ملک میں مذاہب کا سوال تو بقول مولانا محمد علیؒ مذہب سیاست کو نہیں بگاڑتا ہے بلکہ سیاست مذہب کو بگاڑتی ہے، مولانا محمد علی تو اس ملک میں مذہب کی متحدہ ریاست دیکھنا چاہتے تھے، جو ان کے تخیل کے مطابق امریکہ کی متحدہ ریاست سے زیادہ شریف اور زیادہ مضبوط ہو، آخر گاندھی جی مہاتما بن کر ہی تو سیاست میں چھائے رہے، پھر ان میں

اور مولانا محمد علیؒ میں، جو بے مثال جذباتی ہم آہنگی اور قومی یکجہتی پیدا ہوئی وہ ہندوستان کیلئے زریں مثال ہے، اس وقت دونوں کے مذہب نے ایک دوسرے سے دور نہیں رکھا، سیاست نے ایک دوسرے کو دور کر دیا، مجمع میں جو رنگ پیدا ہوا اس سے ظاہر ہوا کہ وہ ان جوابات سے مطمئن تھے۔

اس نشست میں مسلم یونیورسٹی کے ڈاکٹر اکمل ایوبی نے مولانا محمد علیؒ کی حاضر جوابی کے عنوان سے مقالہ پڑھ کر مجلس کو زعفران زار بنا دیا، جدید یونیورسٹی کے پروفیسر ایم ایندوے نے اپنی تقریر میں بتایا کہ ہندوستان میں مذہب کا وفاق یعنی فیڈرلزم ہونا چاہیئے، دار العلوم ندوۃ العلماء کے فاضل مدرس مولانا ابو العرفان ندوی نے مولانا محمد علیؒ کی متنوع شخصیت پر اپنا مقالہ پڑھا۔

اسی روز آخری نشست دہلی کے پروفیسر ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کی صدارت میں ہوئی، اسمیں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے ڈاکٹر احتشام بن حسن نے مولانا محمد علیؒ کی پوری زندگی پر تبصرہ کیا، کلکتہ کے جناب محمد اسحٰق نے مولانا محمد علیؒ کے انگریزی ہفتہ وار کامریڈ پر ایک پرمغز مقالہ پڑھا، روزنامہ ہند کے ایڈیٹر جناب رئیس الدین فریدی نے مولانا محمد علیؒ کی صحافت نگاری کے مختلف پہلو دکھائے، آخر میں جناب خواجہ احمد فاروقی نے اپنی بہت ہی پیاری زبان اور بہت ہی پیارے لہجہ میں مولانا محمد علیؒ کی رنگارنگ شخصیت پر اپنے گرانقدر خیالات سے سامعین کو محظوظ کیا، یہ سیمینار مختلف دعوتوں کے ساتھ مولانا محمد علیؒ کی یادوں کی قندیل اچھی طرح روشن کر کے ختم ہوا۔

ایک شام سیمینار کے مقالہ نگار کلکتہ کی مشہور ایران سوسائٹی میں بھی مدعو تھے، جہاں انکی قدر دانی انکی گل پوشی کر کے کی گئی، اس موقع پر حکومت کے وزیر جناب منصور حبیب اللہ بھی موجود تھے، وہ سب سے بڑی خندہ پیشانی اور فراخدلی سے ملتے رہے، اس مجلس میں ایران سوسائٹی کی گراں بہا خدمات پر تقریریں بھی ہوئیں، اس سوسائٹی کے نائب صدر خواجہ محمد یوسف صاحب اپنی شیریں گفتار سے مجمع پر چھائے رہے۔

کلکتہ کے مختصر قیام میں وہاں کے مشہور سرجن ڈاکٹر مقبول احمد، امینیہ ہوٹل کے مالک حاجی عبد القیوم، اس شہر کے مشہور اخبار دعوت مشرق، روزنامہ آزاد ہند اور آبشار کے دفتر والوں اور انجمن مفید الاسلام والوں نے ہر طرح کی نوازشوں سے ممنون کیا، کلکتہ میدان کی عیدین کی نماز والے امام مولانا اہل قیام گاہ پر برابر آتے رہے اور مفید معلومات فراہم کیں، انجمن مفید الاسلام کے مولانا محمد اسحٰق تو سایہ کی طرح ساتھ رہے، کلکتہ کے مایۂ ناز اہل علم ڈاکٹر عطا کریم برقؔ اور ڈاکٹر محمد صابر خان سے بھی ملاقاتیں رہیں، معارف کے مضمون نگار اور قدر دان جناب آغا رشید کی وفات پر انکے گھر پر جا کر ان کے بھائیوں سے تعزیت کی۔

کلکتہ میں دار المصنفین والوں کی میزبانی وہاں کے مشہور رائل ہوٹل کے مالک اور علم نواز جناب منظور علی صاحب نے کی، ان کی بھلمنساہٹ، انکسار، خوش مزاجی، وضعداری اور میزبانی کے معیار کی مخلصانہ یادوں کے ساتھ ہم لوگ کلکتہ سے رخصت ہوئے۔

مقالات

سرسید احمد خانؒ اور مستشرقین

از عبید اللہ کوٹی ندوی رفیق دار المصنفین

(۲)

حضرت اسمٰعیلؑ کی والدہ | تورات کتاب پیدائش باب ۲۱ آیت ۱۰ میں ہے، "تب اس نے ابرہام سے کہا کہ اس لونڈی کو اور اس کے بیٹے کو نکال دے کیونکہ اس لونڈی کا بیٹا میرے بیٹے اضحاق کے ساتھ وارث نہ ہوگا۔" کئی مستشرقین نے حضرت اسمٰعیلؑ کے نسب نامہ کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کی ہے، جس کی وجہ ظاہر ہے، اور یہود بھی حضرت اسمٰعیلؑ کی والدہ کو لونڈی کہتے تھے، اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ یہودی بنی اسمٰعیل کی ہمیشہ حقارت کرتے ہیں اور ضد و عداوت سے ایسی باتیں جن سے بنی اسمٰعیل بنی اسرائیل کے مقابلہ میں فروتر سمجھے جائیں منسوب کرتے ہیں، اور اسی وجہ سے ان لوگوں نے غلط طور پر توریت مقدس سے بھی حضرت ہاجرہؑ کے لونڈی ہونے پر استدلال کیا ہے، جو سرتاپا غلط اور تحریف کی حیثیت رکھتا ہے، چونکہ اس بحث کا نسب نامۂ نبوی سے بھی گہرا تعلق ہے، اس لئے سرسید مرحوم نے مولانا عنایت رسول چریاکوٹیؒ کی تحقیقات پر مشتمل ایک نفیس بحث بھی درج کتاب کی ہے، چند اہم نکات یہ ہیں:

۱۔ انھوں نے سفر اشعیا سے جو یہودیوں کی ایک معتبر تاریخ ہے، یہ نقل کیا ہے کہ بابل کا ایک باشندہ رقیون تنگ دست اور مفلس تھا، جس نے مصر کی راہ لی، بادشاہ مصر نے

اس کی قدر دانی کی، اعیان سلطنت میں اس کا اثر بڑھتا گیا، یہاں تک کہ وہ بادشاہ ہوگیا، یہ پہلا شخص ہے، جس نے فرعون کا لقب اختیار کیا، پھر قحط سالی کے زمانہ میں حضرت ابراہیمؑ اپنے گھر والوں کے ساتھ مصر گئے تو اس نے حضرت سارہؓ سے نکاح کرنا چاہا مگر پھر باز رہا، اور اس قدر متاثر ہوا کہ اپنی بیٹی ہاجرہ کو حضرت ابراہیمؑ کے نکاح میں دیدیا، رقیون عبرانی زبان کا لفظ ہے، اسی طرح حضرت ہاجرہؓ کا اصل عبرانی نام ھاغا ہے۔ جو اس بات کا قرینہ ہے کہ بادشاہ مصری النسب نہ تھا، بلکہ حضرت ابراہیمؑ کے قبیلہ سے نسبت رکھتا تھا، چنانچہ اس کے پاس سے حضرت ابراہیمؑ بڑے اعزاز اور سامان دہ ابا کے ساتھ روانہ ہوئے۔ (پیدائش باب ۱۳ ورس ۱-۶)

۲۔ مفسرین توریت بھی حضرت ہاجرہؓ کو بادشاہ مصر کی بیٹی لکھتے ہیں، چنانچہ ربی شلومو اسحاق نے کتاب پیدائش باب ۱۶، آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ سرسید مرحوم نے اصل عبرانی تحریر اور اس کے عربی ترجمہ کے ساتھ درج ذیل اردو ترجمہ بھی تحریر کیا ہے:

"وہ فرعون کی بیٹی تھی، جب دیکھا ان کرامات کو جو بوجہ سارہ واقع ہوئیں تو کہا بہتر ہے کہ رہے میری بیٹی اس کے گھر میں خادمہ ہوکر اس سے کہ ہو دوسرے کے گھر میں ملکہ۔"

حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ میں لونڈی میراث نہیں پاتی تھی، تو رات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سارہؓ کو یہی اندیشہ تھا کہ حضرت اسمٰعیلؑ، حضرت اسحاقؑ کے ساتھ میراث پائیں گے چنانچہ انھوں نے ہاجرہ کو الگ کر دینے کی درخواست کی۔ اور انھوں نے ہاجرہ کو جو لونڈی کہا تو یہ غصہ اور ناراضگی کی وجہ سے تھا، جس سے دیگر تصریحات کی موجودگی میں استدلال کرنا درست نہیں، تورات میں اور دوسرے مقامات پر حضرت ہاجرہؓ کے لیے شفحہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی خادمہ اور قبیلہ کی عورت کے ہیں، تورات (سموئیل باب ۲۵ آیت ۴۱) میں حضرت داؤد کی

بیوی کے بارے میں جو زوجہ شرعی تھیں، شفحہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، جس کا ترجمہ اگرچہ لونڈی کیا گیا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ وہ آزاد تھیں، اور یہ لفظ ان کے لیے خادمہ کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ (خطبات ۱۶۳-۱۶۵) سرسید مرحوم کے نزدیک :-

"توریت مقدس سے کسی طرح حضرت ہاجرہؓ کا لونڈی ہونا ثابت نہیں ہے، نہایت صاف اور روشن بات ہے کہ اس وقت کے حالات پر جو ہم نظر کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے، کہ اس زمانہ میں لونڈی غلام دو طرح پر ہوتے تھے، شرا (خریداری) سے اور غنیمت سے یعنی یا تو وہ لونڈی و غلام ہوتے تھے، جو لڑائی میں اسیر ہو کر آتے تھے، اور شبوث حرب کہلاتے تھے، یعنی غنیمت جنگ صیف یا وہ لونڈی اور غلام کہلاتے تھے، جو خریدے جاتے تھے، اور ان کو مقنت کشف کہتے تھے، یا ان کی اولاد لونڈی و غلام ہوتے تھی، یلید بائث ولید البیت یعنی خانہ زاد، مگر حضرت ہاجرہؓ ان باتوں سے پاک تھیں، پھر وہ کیونکر لونڈی ہو سکتی تھیں، ان کو لونڈی کہنا محض بہتان ہے۔" (ایضاً ص ۱۶۷)

عربوں کا علم الانساب اور اس کی اہمیت

حضرت ابراہیمؑ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نسبی رشتہ کے بارے میں بحث کرتے ہوئے مستشرقین نے عربوں کے علم الانساب پر بھی اعتراضات کئے ہیں، جن کو سرسید مرحوم نے "ایک طرف دار مصنف کے خیالی شوشے" سے تعبیر کیا ہے، کہا یہ گیا ہے کہ

"اس بات کا فرض کر لینا کچھ ضرور نہیں ہے، کہ ان کے انساب کا علم یا روایت خود ان قوموں میں بجنسہ چلی آتی ہے، ..... یہ بات بالکل بعید از عقل معلوم ہوتی ہے کہ ایسی وحشی قوم کے پاس جس کے پاس کوئی تحریری یادداشت نہیں ہے، ان کو اپنے نسب کی واقفیت اتنی صدیوں تک محفوظ اور برقرار رہی ہو۔" (خطبات احمدیہ ص ۳۸)

سرسید مرحوم نے اپنے خیالات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ جو ملکی روایتیں عرب کی

مختلف قوموں کی تقسیم کے بارے میں ہیں، وہ نہایت معتبر ہیں، کیونکہ" عرب اپنے آبائی رسوم اور اوضاع اور اطوار کے بدرجۂ غایت پابند تھے، وہ اپنے نسب ناموں کو یاد رکھنا اپنا فرض سمجھتے تھے، اور یہی وجہ تھی کہ ہر ایک قوم نہیں بلکہ ہر ایک قبیلہ اپنا جدا نام رکھتا تھا، اور اس ذریعہ سے ہر ایک شخص اپنی قوم اور قبیلے کو بہ خوبی جانتا تھا، اور اپنے حسب و نسب پہ بے انتہا فخر کرتا تھا، لڑائیوں میں مردانہ اشعار پڑھنا، اور لڑنے والوں کا ان کے حسب نسب کا جتلانا جنگی باجے کا کام دیتا تھا، انھوں نے اپنے اس بیان کی تائید میں ریورنڈ مسٹر فارسٹر کی تحریر بھی پیش کی ہے' وہ اپنے جغرافیۂ عرب میں لکھتے ہیں کہ "عربوں کی قدیمی اوضاع اور رسوم اور یادگاروں کی پابندی کو جو ہمیشہ سے زبان زد خاص و عام ہے، تمام دلائل میں سب سے اوّل رکھنا مناسب ہے، کیونکہ اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ ان کے قومی خاصوں میں سے یہ خاصہ سب سے مقدم ہے، (خطبات احمدیہ ص۳۶)

پھر سرسید مرحوم یہ بیان کرتے ہیں کہ ملک عرب کی ملکی روایتیں نہایت عمدہ اور صحیح ذریعہ ملک عرب کے حالات دریافت کرنے کا ہے، ان کی رسوم کا علم مندرجۂ ذیل ذریعوں سے ہو سکتا ہے، میدان جنگ میں کوئی جنگ آور بدون اس کے کہ حریف سے اپنا حسب و نسب بہ آواز بلند بیان کرے تنہا لڑائی میں مشغول نہیں ہوتا تھا۔ کسی عام مہم میں ہر شخص اپنے ہی قوم کے سردار یا رئیس کے جھنڈے کے نیچے قیام کرتا تھا، جب کسی قوم کے کسی آدمی سے کوئی جرم سرزد ہوتا تھا، تو اس کی پاداش میں اس ساری قوم کے لوگوں کو جرمانہ دینا پڑتا تھا، جو اب شرع میں بلفظ الدیۃ علی العاقلہ مستعمل ہے، اس قسم کے رسوم کا نتیجہ یہ ہوا کہ عرب کے لوگوں کو اپنی قوم کو چھوڑ کر دوسری قوم میں جا ملنا غیر ممکن ہو گیا تھا، اور اسی بنا پر جزیرہ عرب کے مختلف اقطاع پر تقسیم ہونے کی روایتوں پر اعتبار قائم ہوا، اور برقرار رہا، وہ اپنی طویل بحث کے اختتام (ایضاً ص ۱۳۷) پہ ریورنڈ مسٹر فارسٹر کا یہ قول فیصل نقل کرتے ہیں کہ

"محققین یورپ کی رائے میں عربی روایتوں کی غیر مؤیدہ شہادت کیسی ہی قابل اعتراض اور مشکوک کیوں نہ ہو مگر منصفانہ بحث کے مسلمہ قواعد کی رو سے ان کا قطعی اتفاق تواریخ دینی اور دنیوی سے انکار کرنا صریحاً غیر ممکن ہے، خود عربوں کے ہاں زمانۂ نامعلوم سے یہ ایک روایت چلی آتی ہے کہ قیدار اور اس کی اولاد ابتداءً حجاز میں آباد ہوئے تھے، اس شخص کی اولاد میں ہونے کا بالتخصیص قوم قریش جو مکہ کے والی اور کعبہ کے محافظ تھے ہمیشہ فخر کیا کرتے تھے، اور خود محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے قرآن میں اپنی قوم کی ریاست اور اعزاز کے دعووں کی اسی بنا پر تائید کی ہے کہ اسماعیل کی اولاد قیدار کے سلسلہ سے تھی، ایسی قومی روایت کا اعتبار جیسے کہ یہ ہے تاریخی روایت کے پایے کو پہنچ جاتا ہے، جب کہ اس کی تائید ایک طرف تو کتب مقدسہ کے ان بیانات سے ہوتی ہے جن سے قیدار کی اسی حصۂ جزیرہ نما میں ہونا ثابت ہوتا ہے، اور دوسری جانب اریانوس، بطلیموس، پلینی اکبر کے زمانوں میں ملک حجاز میں قوم کیڈری' ورانی، کہ رون تائی، پاکدینی کی موجودگی کے غیر مشتبہ اور ناقابل اشتباہ امر سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ (جغرافیۂ تاریخی جلد ۱ صفحہ ۲۴۰)

اسلام کے ذریعہ تکمیل دین

اپنی کتاب کے تیسرے خطبہ میں سرسید مرحوم نے ان مختلف مذاہب کا ذکر کیا ہے، جو اسلام سے پہلے عرب میں موجود تھے، اور یہ بتایا ہے کہ اسلام مختلف معاملات میں کن کن مذاہب سے مشابہت رکھتا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ "ان مذاہب کے بھاری بوجھ کے نیچے ملک عرب ایک مذبوحی حرکت کر رہا تھا کہ دفعۃً اسلام نمودار ہوا، اور اس کو حیرت انگیز سرور میں ڈال کر اس کا غیر متحمل بوجھ دور کر دیا، اور یک دفعہ جزیرۂ عرب کے چاروں کونوں کو صدق کے نور سے بھر دیا" اس کے بعد انھوں نے یہ بتایا ہے

اسلام نے عرب کے مختلف مذاہب میں کیا اصلاحات کیں، ان کی کن باتوں کو برقرار رکھا اور کن امور میں ان سے مخالفت کی، اس کے بعد عیسائیوں کا یہ اعتراض کہ "اسلام درحقیقت اصول و عقائد متفرقہ و منتشرہ مذاہب سابقہ کی محض ایک ترتیب اور اجتماع کا نام ہے۔" پیش کرنے کے بعد اس بات پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہیں کہ

"یہ مشابہت اصول اسلام کی دیگر مذاہب الہامی کے اصول سے اسلام کے پاک اور الہامی ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے، تمام چیزیں جن کا مبدا ایک ہی غیر منتہی اور کامل ذات ہو، ضرور ہے کہ ایک ہی قسم کی اور ایک ہی کامل اصول پر ہونگی جس طرح کہ خدا تعالیٰ سے اپنا مثل پیدا کرنا غیر ممکن ہے، اور جس طرح کہ اس کی ذات سے کسی پیدا کی ہوئی چیز کو اپنی مرضی اور اپنی حکومت کے احاطہ سے خارج کر دینا محال ہے، اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے کہ ایک ہی غرض کے انجام دینے کے لیے دو متناقض اصول اور احکام اس کی ذات سے صادر ہوں، مسلمانوں کو بلکہ تمام دنیا کو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہمیشہ ممنون رہنا چاہئے، جنھوں نے ابتداے دنیا سے اپنے زمانہ تک کے تمام نبیوں کی رسالت کو برحق ٹھرایا، جنھوں نے تمام الہامی مذہبوں کی تکمیل کی اور جنھوں نے اپنے باایمان متبعین کے لیے بے بہا اور لازوال نور کے دروازے کھول دیئے۔"

(خطبات احمدیہ ص ۲۲۳)

صدائے جنگ

سرولیم میور نے اپنی کتاب میں کئی جگہ اسلام کے محاسن بھی بیان کیے ہیں جس پر سرسید مرحوم نے یہ لکھکر بجا طور پر ان کی تحسین کی ہے کہ "سرولیم میور ایک نہایت دیندار عیسائی ہیں، اور جب تک علانیہ اور نہایت روشن بات نہ ہو اسلام کے حق میں گواہی نہیں دے سکتے" اس کے بعد شکرگزاری کے جذبہ کے ساتھ سرولیم میور کے خیالات نقل کیے ہیں، لیکن اس درمیان

اسلام کی صدائے جنگ کے رو برو بت پرستی موقوف ہوگئی۔" کے جملہ پر گرفت کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"سرولیم کی اس تحریر پر میں کچھ حاشیہ لکھنا چاہتا ہوں، میں سمجھتا ہوں کہ صدائے جنگ نے بت پرستی کو معدوم نہیں کیا، بلکہ اس سچے وحدانیت کے وعظ نے بت پرستی کو معدوم کیا ہے، جس کا اثر قرآن مجید کے نہایت فصیح اور پر تاثیر فقروں سے لوگوں کے دلوں پر ہوتا تھا، اور نہ صرف عرب سے بت پرستی کو نیست و نابود کیا بلکہ تمام مذہبوں میں جو اس وقت دنیا میں رائج تھے، اور وہاں تک وعظوں کی آواز پہنچی تھی اس خیال کو پیدا کر دیا کہ بت پرستی نہایت کمینہ خصلت اور ایک سخت گناہ ہے۔

(خطبات احمدیہ ص ۲۲۶)

اڈورڈ گبن

سرسید احمد مرحوم نے اڈورڈ گبن کی تحریریں بھی، اپنی تائید میں، بڑی فراخ دلی سے نقل کی ہیں، لیکن وہ ان پر گرفت بھی کرتے جاتے ہیں، ایک جگہ وہ گبن کے اس جملہ پر چونک پڑے کہ "(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے) عقبیٰ کی جزا و سزا ایسی تمثیلوں میں بیان کی جو ایک جاہل اور ہوا پرست قوم کی طبیعت کے نہایت موافق تھیں"۔ اس پر ان لفظوں میں تبصرہ کرتے ہیں:

"انھوں نے یہ خیال نہیں کیا کہ عقبیٰ کی سزا و جزا کا بیان غیر ممکن ہے، اَن دیکھی، اَن چھوئی، اَن چکھی، اَن سمجھی چیز کیونکر سمجھ میں آسکتی ہے، جس چیز کیلئے لفظ ہی انسان کی زبان میں نہ ہو وہ کیونکر بیان ہوسکتی ہے، کیفیت جو ایک ذاتی وجدانی چیز ہے وہ دوسرے کو کیونکر بتلائی جاسکتی ہے، یہ تمام امور محالات سے ہیں، پس وحی یا الہام ان کو کیونکر بیان کرسکتا ہے، سچا اور صحیح مسلمانی مسئلہ سزا و جزا کا یہ ہے، "لا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر"۔ پس کوئی بیان کرنے والا گو کہ وہ الہام ہی کی زبان ہو جزا کو بجز اس کہ نہایت ہی محبوب چیز ہے، اور سزا کو بجز اس کے کہ نہایت ہی

موذی چیز ہے، اور کچھ نہیں بتا سکتا، سو وہ بھی دنیا ہی کی محبوب اور موذی چیزوں پر قیاس ہو سکتا ہے، نہ عقبیٰ کی واقعی محبوب و موذی چیز پر، اس لئے تمام انبیاء نے دنیا ہی کی محبوب و موذی چیزوں کی تمثیل میں عقبیٰ کی سزا و جزا کا بیان کیا ہے، موسٰیؑ یہی فرمایا کئے کہ نیک کام کرو گے تو مینہ برسے گا غلہ پیدا ہوگا۔ وبا نہ ہوگی، گناہ کرو گے تو قحط پڑے گا، وبا پھیلے گی۔" (خطبات احمدیہ ص ۲۲۹)

چند معاشرتی مسائل پر اعتراضات

سر ولیم میور نے اسلام کے چند معاشرتی مسائل پر یہ اعتراضات کئے ہیں کہ مذہب اسلام سے تین بڑی خرابیاں پیدا ہوئی ہیں اوّل یہ کہ اس میں ایک سے زیادہ بیویوں کا ہونا، طلاق دیدینا، اور غلام بنا لینا وہ باتیں ہیں، جو علم اخلاق کی بیخ کنی کرتی ہیں، عام زندگی کو آلودہ اور ناپاک کرتی ہیں، اور حسن معاشرت اور انسان کے گروہوں کی حالت کو درہم برہم کر دیتی ہیں، دوم یہ کہ مذہبی آزادی روک دی گئی ہے، بلکہ معدوم کر دی گئی ہے، تحمل کا نام و نشان بھی نہیں دکھائی دیتا، سوم یہ کہ مذہب عیسائی کی ترقی میں اور اس مذہب کے قبول کرنے میں ایک مزاحمت قائم کی گئی ہے۔

(ایضاً صفحہ ۲۳۰)

سرسید مرحوم کے خیال میں، عیسائی مصنفین، مسلمانوں کی مخالفت میں، سنجیدگی، اور نیک نیتی کو برقرار نہیں رکھ سکے، اپنی عیب جینی کے مصمم ارادہ کی وجہ سے وہ اس بات کی طرف دھیان نہیں دے سکے کہ آب و ہوا، مرد و عورت کی تعداد اور مختلف طبعی اسباب کا گہرا اثر معاشرتی حالات پر پڑتا ہے۔

تعدد ازدواج

سرسید احمد خان کی نظر میں اس بات کا خیال کرنا ایک بڑی غلطی ہے، کہ مذہب اسلام میں ایک سے زیادہ بیویاں رکھنا، مسلمانوں پر لازمی یا کچھ زیادہ کار ثواب کی بات ہے، حالانکہ یہ اجازت

صرف ان لوگوں کے لیے ہے، جن کو مختلف اسباب طبعی سے ایسا کرنے کی ضرورت ہو، اس کے بعد وہ قانون قدرت، باہمی معاشرت اور مذہب کی رو سے، مسئلہ ازدواج پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"پہلے ہم اس بات پر غور کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ دریافت کریں کہ اس امر میں تمام ذی روح مخلوقات کے پیدا کرنے والے کی مرضی اور ارادہ کیا تھا، پس ہم قانونِ قدرت کی بے خطا نشانیوں سے پاتے ہیں کہ جن ذی روح کی نسبت ان کے خالق کا یہ منشا تھا، کہ ان کے صرف ایک ہی مادہ ہو، ان کی نسل ہمیشہ جوڑا جوڑا پیدا ہوتی ہے، جن میں سے ایک نر و ایک مادہ پیدا ہوتا ہے، برخلاف اس کے جن ذی روح کی متعدد مادائیں ہونی مقصود ہیں ان کے ایک سے زیادہ بچے ہوتے ہیں، اور اس بات کا کچھ لحاظ نہیں ہوتا کہ نر و مادے کی تعداد میں باہم ایک ہی نسبت ہو اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جو جاندار زمین پر رہنے والے اور چلنے والے ہیں، وہ اکثر بلکہ تقریباً سب اسی قسم کے ہیں، پس اس قانون قدرت کے بموجب انسان بھی اسی دوسری قسم میں داخل ہے، مگر (چونکہ) وہ تمام مخلوقات سے اشرف ہے، اس لئے اس کا فرض ہے کہ جو قوتیں اور حقوق قدرت نے اس کو عطا کئے ہیں، ان کو احتیاط سے اور موقع بہ موقع بہ لحاظ امور طبعی اور حسن معاشرت اور انتظام خانہ داری یا نظم ملکی و قوانین حفظان صحت اور ملکی تاثیرات آب و ہوا کے کام میں لائے، پس جیسے کہ کثرت ازدواج اکثر حالتوں میں قابل نفرت ہے ویسے ہی ایک سے زیادہ نہ ہونے کا قطعی التزام خلاف فطرت ہے۔ (خطبات احمدیہ۔ ص ۲۳۹)

تعدد ازدواج کے معاشرتی پہلو کو سرسید نے تفصیل سے بیان کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے

انسان مدنی الطبع پیدا ہوا ہے، اسی بات کو توارت میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ "جب خدائے تعالیٰ کو یہ خیال آیا کہ انسان کا اکیلا ہونا اس کے حق میں اچھا نہیں ہے، تو اس نے اس کے واسطے ایک ساتھی پیدا کیا، اور وہ عورت ہے جو اس واسطے پیدا کی گئی ہے کہ انسان کی زندگی کے فکر و تردد اور رنج و راحت میں شریک ہو، اور مرد کے ساتھ شریک ہو کر اس بڑے حکم کی تعمیل میں کہ "بڑھو اور پھلو اور زمین کو آباد کرو" مدد دے، مگر جب وہ کسی سبب سے ان قدرتی فرائض کی ادائیگی میں قاصر ہو تو اس نقصان کے رفع کرنے کی تدبیر اس کے سوا اور کوئی نہیں کہ ایسی حالتوں میں ایک سے زیادہ مگر کسی خاص حد تک، ایک ہی وقت میں بیویاں رکھنے کی اجازت ہو یا پہلی بیوی کو طلاق دینے کے بعد دوسری سے نکاح کرلے، یہ حق عورت کو بھی حاصل ہونا چاہئے تھا، چنانچہ مذہب اسلام کی رو سے اس کو یہ حق ہے، مگر سیاست مدن کے لحاظ سے صرف اتنا فرق ہے کہ مرد جب چاہے یہ علاج کرسکتا ہے، لیکن عورت کو پہلے قاضی کی اجازت حاصل کرنی چاہئے، اس تدارک کی انسان کو اجازت نہ ہوتی، تو اس کے سبب سے حسن معاشرت میں بڑا خلل واقع ہوتا، اور انسان کو بدترین گناہوں کی طرف مائل ہونا پڑتا، تعلیم و تربیت کے ذریعہ اس ضرورت کا کم ہونا تو ممکن ہے، لیکن اس کا مٹنا محالات سے ہے، اس لئے جہاں ضرورت ہو وہاں اس پر عمل پیرا نہ ہونے سے نقصانات ہونگے جو حسن معاشرت کے لئے سم قاتل ہیں، (خطبات احمدیہ ص ۲۲۱) سرسید مرحوم نے تعدد ازدواج کی تائید میں دو مستشرقین کی آراء بھی نقل کی ہیں کہ

"گرم ملکوں میں جہاں عورتیں جلد بوڑھی ہو جاتی ہیں، ضرورت ہے کہ تعدد ازدواج کا قاعدہ جاری کیا جائے"۔ (مسٹر مانٹیگو) "ایشیا کے گرم ملکوں کی تاثیر سے دونوں گروہ یعنی مرد و عورت میں ایک ایسا اختلاف ہوتا ہے جو یورپ کی آب و ہوا میں نہیں ہے، جہاں دونوں برابر بتدریج عالم ضعیفی کو پہنچتے ہیں، مگر ایشیا میں صرف مرد ہی کو

یہ بات حاصل ہے کہ ضعیفی میں بھی قوی اور طاقتور رہتا ہے، اگر یہ بات سچ ہے، تو بانی اسلام کے لئے اس بات کی کہ انھوں نے کئی بیویوں کی اجازت دی ایک بڑی وجہ تھی"۔

(سر ڈبلیو اوسلی)

لیکن ان مذکورہ بالا تائیدی آراء سے سرسید کو کامل اتفاق نہیں جس پر وہ ان الفاظ میں تبصرہ کرتے ہیں۔

"افسوس ہے کہ ان دونوں صاحبوں نے تعدد ازدواج پر صرف امور طبعی کے لحاظ سے نظر کی ہے، مگر اسلام میں یہ اجازت خاص خاص حالتوں میں صرف امور طبعی کے لحاظ سے نہیں دی گئی، بلکہ زیادہ تر اس لحاظ سے دی گئی ہے کہ تزوج کی تلخیوں اور مقاصد تزوج کے فوت ہوجانے کی حالت میں ایک تدارک حاصل ہو، جو عین مرضی آدم و حوا کے پیدا کرنے والے کی اس کی قدرت کے کاموں کی نشانیوں سے معلوم ہوتی ہے" (خطبات احمدیہ ص ۲۲۱)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے عرب اور اس کے گرد و نواح میں نکاح و شادی سے متعلق بہت سی اخلاقی خرابیاں پائی جاتی تھیں، سرسید مرحوم کے بقول ایران میں قوانین طلاق بالائے طاق رکھدیئے گئے تھے، اور رشتہ داری کا پاس و لحاظ نہیں تھا، یہاں تک کہ بیٹے کو اس کی ماں ایسے ہی مباح تھی جیسے باپ کو اس کی بیٹی اور بھائی کو اس کی بہن، یہودیوں کے یہاں جو ایران کے گوشہ مغرب میں بکثرت آباد تھے تعدد ازدواج کی رسم کسی قید اور حد کے بغیر بے روک ٹوک جاری تھی، عرب میں ایرانیوں اور یہودیوں دونوں کی رسمیں یکساں جاری تھیں، تعدد ازدواج کی کچھ انتہا نہ تھی، تمام عورتیں بغیر کسی امتیاز یا رتبہ یا عمر یا رشتہ داری کے، مردوں کی وحشیانہ خواہشوں کے پورا کرنے کا کام دیتی تھیں، عیسائیوں کا حال ان سب کے برعکس تھا، ان کے یہاں ایک بیوی کرنی بھی کچھ نیکی شمار نہ ہوتی بلکہ رہبانیت اور تجرد محض کی

عام ہدایت تھی، اور مرد و عورت دونوں کے لئے یہی نیکی کا کام تصور کیا جاتا، ایسے زمانہ میں جبکہ
عقل و دل کی تاریکی چھائی ہوئی تھی، اور اخلاق و معاشرت اس قدر بگڑ چکی تھی، اسلام نے ایسا
عمدہ قانون جاری کیا جو اپنی اصلیت کے لحاظ سے نہایت کامل عقل کامل کے بالکل مطابق
انسان کی تندرستی بہبودی اور حسن معاشرت کی ترقی کا نہایت عمدہ ذریعہ اور زن و مرد کی حالت
زوجیت کے حق میں اور دونوں کے لیے اس کی تلخیوں کے دور کرنے میں نہایت ہی مفید ہے (خطبات احمدیہ ص ۲۴۴)

سرسید مرحوم نے مذہبی نقطۂ نظر سے بھی تعدد ازدواج کا جائزہ لیا ہے، جس کا
خلاصہ یہ ہے کہ جس خوبی سے اسلام نے تعدد ازدواج کو روکا ہے، اس طرح نہ یہودیوں کے مذہب نے
اس کی بندش کی ہے، اور نہ عیسائی مذہب نے، یہودیوں کے یہاں بکثرت اور بلا تعیین حد ازدواج
موجود ہے، عیسائی مذہب نے بھی تعدد ازدواج کی کہیں ممانعت نہیں کی، چنانچہ مسٹر ہگنز لکھتے ہیں کہ
"میں نہیں جانتا متعدد بیویوں کی اجازت کی نسبت اسلام پر ایسا سخت طعن کیوں کیا جاتا ہے؟ حضرت
سلیمانؑ اور حضرت داؤدؑ کی نظیر پر جو خدا کی مرضی پر چلتے تھے اور جن کو خدا نے خاص اپنی شریعت کے
احکام کی تعمیل کے لیے بنایا تھا، یہ امر ہرگز اعتراض کے لائق نہیں ہے، خصوصاً اس وجہ سے کہ عیسیٰ مسیح
نے بھی ان بیس انجیلوں میں سے جن کو ان کے معتقدوں نے ان کے احکام کو قلمبند کرنے کے لیے
تحریر کیا تھا، کسی انجیل میں اس کی ممانعت نہیں کی۔" جان ڈیون پورٹ نے بھی اپنی کتاب میں بائبل
کی بہت سی آیتوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ "ان آیتوں سے معلوم ہوتا ہے، کہ تعدد ازدواج صرف
پسندیدہ ہی نہیں بلکہ خاص خدا نے اس میں برکت دی ہے۔" (ایضاً ص ۲۴۵) اس کے بعد
سرسید مرحوم تحریر فرماتے ہیں :-

"اب ہم کہتے ہیں کہ اسلام نے تمام مذہبوں سے بڑھ کر تعدد ازدواج کو نہایت
خوبی سے روکا ہے، اور صرف ایک ہی بیوی کرنے کو پسند کیا ہے، اور تعدد کو صرف ایک نہایت

مجبوری خاص حالت میں جائز رکھا ہے، ہم کو کچھ شبہ نہیں کہ سچا مسئلہ سچے مذہب کا یہی ہو سکتا
ہے کہ عموماً کثرت ازدواج کی ممانعت اور صورت ہائے خاص اور حالات مستثنیٰ میں اجازت ہو
اس عمدہ اور مفید قاعدہ کی بیجا عمل درآمد کرنے سے وہ لوگ اس خدا کے سامنے جوابدہ
ہوں گے، جو انسانوں کے دلوں کا محرم راز ہے، اور وہ یقیناً ان کو اس قسم کی سزا دے گا
جو ان کے گناہ کے لحاظ سے واجب ہوگی۔ جو تعدد ازدواج اس زمانہ میں رائج ہے اور
ہمارے دوسرے بھائیوں نے ایک حیلہ متعہ کا جو جاہلیت میں تھا، اسلام میں پیدا کر کے
عورتوں کو کرنا شروع کر دیا، ان سب باتوں کو مذہب اسلام سے کچھ تعلق نہیں، ایسے
افعال پر اسلام کی خوبی و حقیقت سے چشم پوشی کرنا، چمگادڑوں کے لئے آفتاب کا سیاہ کرنا ہے

(خطبات احمدیہ ملخصاً - ص ۲۴۹)

طلاق سر ولیم میور نے اسلام میں اجازت طلاق کے مسئلہ پر بھی اعتراض کیا ہے، جس کے جواب
میں سرسید مرحوم اس بات کو تو تسلیم کرتے ہیں کہ سب سے بڑا دشمن حسن معاشرت و تمدن کا طلاق ہے۔
جس سے نکاح کی وقعت گھٹ جاتی ہے، اور مرد کی محبت کا عورت کے ساتھ اور عورت کی
وفاداری کا مرد کے ساتھ اعتبار نہیں رہتا۔" لیکن اس کے باوجود

"اس بات سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ اگر کسی سبب سے ایسی خرابیاں مرد و عورت
میں پیدا ہو جائیں جو کسی طرح اصلاح کے قابل نہ ہوں تو ان کا بھی کچھ علاج ہونا چاہیے، اور
وہ علاج طلاق ہے بطور ایک علاج کے، اسی حالت میں اس کی طرف رجوع کرنا
جائز ہو سکتا ہے جب کہ اس پر عمل کرنے سے ایسی مصیبتیں جو طلاق کی مصیبتوں سے بھی زیادہ
ناقابل برداشت ہوں اور ایسے تردوات و تفکرات جو طلاق سے بھی زیادہ رنج دینے والے
اور رنجشیں پیدا کرنے والے ہوں دور ہو سکتے ہوں اگر ایسی حالت میں طلاق کو جائز رکھا جائے

جیسا کہ اسلام نے ایسی حالت میں جائز رکھا ہے، تو وہ کسی طرح حسن معاشرت کے خلاف
نہیں بلکہ اس کی اصلاح کرنے والی اور ترقی دینے والی ہے۔" (خطبات احمدیہ ص ۱۷۱)

انھوں نے طلاق کے بارے میں یہودی اور عیسائی مذاہب کے طرز عمل کا بھی جائزہ دے کر
یہ واضح کیا ہے کہ "یہودیوں کے یہاں طلاق دینا، کسی قید و شرط کے بغیر مرد کے اختیار میں تھا، وہ
جب چاہتا طلاق لکھ کر بیوی کو دیدیتا، اور اس پر کوئی گناہ عائد نہ ہوتا تھا حضرت عیسیٰ نے
اس حکم کو منسوخ کر دیا، اور جیسا کہ اس زمانے کے عیسائی سمجھتے ہیں، سوائے زنا کے اور کسی حالت
میں طلاق کو جائز نہیں رکھا، یہ ایسا سخت حکم تھا جس کی برداشت انسان کی طاقت سے باہر
تھی، اگر یہ حکم اسی طرح مانا جائے جیسا کہ آج کل عیسائی مانتے ہیں، تو حسن معاشرت کیلئے نہایت
ہی مضر ہے، اور جو رنج دہ امور، زن و شوہر میں واقع ہو کر تمام ازدواجی مقاصد کی بربادی کا سبب
بنتے ہیں، اس کا کچھ بھی علاج نہیں ہے، اس صورت میں تو زن و مرد دونوں کے لیے اور بہت سی
خرابیوں اور خوفناک حالتوں میں پڑنے کا اندیشہ ہے" چنانچہ جان ملٹن نے بائبل کی مختلف آیتوں
سے طلاق کے جواز پر استدلال کیا ہے، نہ کہ اس کی ممانعت پر جیسا کہ اس زمانہ کے عیسائی سمجھتے ہیں!

سرسید جان ملٹن کی یہ پوری بحث نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں

"جان ملٹن نے اپنی بحث میں جو کچھ روشنی بائبل کے درسوں (آیتوں) پر ڈالی
ہے، وہ سب اسلام کی روشنی سے لی گئی ہے، کیونکہ اسلام نے بارہ سو برس پیشتر
بتا دیا تھا کہ طلاق بطور معجون مفرح استعمال کرنے کے لئے نہیں بلکہ صرف ایک
لاعلاج مرض کا علاج ہے، مگر زن و شوہر کا معاملہ ایسا نازک ہے کہ اگر اس میں
بیماری پیدا ہو جائے تو سوائے انہی دونوں کے اور کوئی تیسرا شخص اس بات کی
تشخیص نہیں کر سکتا کہ آیا وہ اس حد تک پہنچ گئی ہے جس کا علاج بجز طلاق کے اور

کچھ نہیں ہے، اس لئے اسلام نے اس مرض کی تشخیص نہ کسی جج یعنی قاضی کی رائے پر
منحصر کی ہے نہ کسی مفتی کے فتوے پر بلکہ صرف شوہر کی رائے اور اخلاق پر جس کی
تسلی اور موانست کے لیے ابتدا میں عورت بطور انیس دلنواز اور مونس
غمگسار پیدا ہوئی تھی۔ (خطبات احمدیہ ص ۲۶۰)

سرسید احمد خاں نے ان تعلیمات نبوی کو بھی نقل کیا ہے، جن میں مرد و عورت کی اخلاقی تربیت
اور زن و شوہر میں یکجہتی اور محبت و دانش کی ہدایات اور تدبیریں بتائی گئی ہیں، اور جن میں طلاق
سے امکانی حد تک بچنے، اور مجبوری کی صورت میں سوچ سمجھ کر، مناسب وقفوں میں تدریج کے
ساتھ تفریق کی اس کارروائی کو روبہ کار لانے کی ہدایت کی گئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
عورتوں کے ساتھ محبت رکھنے، مہربانی اور خاطرداری سے پیش آنے، ان کی سختی اور بدمزاجی کو
برداشت کرنے کی نہایت تاکید فرمائی، اور یہ سب باتیں اسی مکروہ چیز یعنی طلاق کو روکنے
کے لیے ہیں اپنی اس بحث کے اختتام پر وہ بڑی جرأت کے ساتھ لیکن ہمدردانہ لب و لہجہ میں
یہ وضاحت بھی کرتے ہیں کہ:-

"اسلام صرف اسی حالت میں طلاق کی اجازت دیتا ہے، کہ وہ زن و شوہر
کے حق میں ایک بیش بہا نعمت ثابت ہو اور اس کے ذریعہ سے حالت زوجیت کی
تمام تلخیاں رفع ہو جائیں یا کم ہو جائیں، اور بغیر اس کے حالت معاشرت روز بروز خراب
ہوتی جائے، اس صورت میں ظاہر ہے، کہ طلاق بجائے اس کے کہ حسن معاشرت
کے حق میں مضر ہو، دو زن و شوہر دونوں کے حق میں ایک برکت اور حسن
معاشرت کی ترقی کا کامل ذریعہ ہوگی، ہاں میں اس بات کو قبول کروں گا
کہ مسلمانوں نے اس عمدہ حکم کو نہایت قابل نفرت طریقہ پر استعمال کیا ہے۔

پس ان کے افعال کی نفرین انہی پر ہونی چاہئے نہ مذہب اسلام پر جو عمدہ طریقہ اس باب میں اسلام نے اختیار کیا ہے، وہ عقل، انصاف اور معاشرت کی نظر سے ایسا عمدہ ہے۔ کہ اس سے بہتر ہو ہی نہیں سکتا اور صاف صاف یقین دلاتا ہے کہ یہ مسئلہ اسی استاد کا بتایا ہوا ہے، جس نے انسان کو پیدا کر کے اس کے لئے، اس کا جوڑا پیدا کیا تاکہ اس کی تسلی اور دل کی خوشی کا باعث ہو" (خطبات احمدیہ۔ ص ۲۶۳) (باقی)

سلسلۂ مقالات سلیمان

سید صاحب نے قومی، ملی، دینی، فقہی، تعلیمی، وعلمی مضامین کے علاوہ مولانا شبلی کے تتبع میں بہت سے محققانہ مضامین بھی لکھے ہیں، اور ان میں انھوں نے بڑے بڑے انکشافات کئے ہیں، مثلاً بحر ہند اور بر اعظم امریکہ تک کے دریافت کرنے والے یورپ کے جہازران داسکوڈیگاما وغیرہ نہیں، عرب کے جہازراں تھے، جو دن رات دنیا کے سارے سمندروں کا چکر لگایا کرتے تھے، اور نئی نئی دریافتیں کرتے تھے،

اس سلسلہ کی پہلی جلد ان کے انہی معرکۃ الآرا تاریخی مقالات پر مشتمل ہے، دوسری جلد میں ان کے علمی وتحقیقی مضامین ہیں، تیسری جلد میں ان کے مذہبی، قرآنی اور فقہی مقالات ہیں، ایک جلد ان کے خالص ادبی ولسانی وتنقیدی مقالات پر مشتمل ہوگی، ایک جلد ان کے خطبات پر مشتمل ہوگی ایک جلد میں مختلف ملکوں اور خود ہندوستان کے اندر ان کے تمام سفروں کی روداد ہوگی، ایک جلد ان کے متکلمانہ مقالات کی ہوگی، جو انھوں نے تاریخ اسلام پر یورپ اور امریکہ کے ممتاز مستشرقین کے اعتراضات اور ان کی نکتہ چینیوں کے جواب میں لکھے ہیں، اسلام اور مستشرقین کے عنوان سے جو نیا سلسلہ شروع کیا گیا ہے، اس سلسلہ میں یہ جلد عنقریب شائع ہوگی۔

"منیجر"

ہندوستان کی سیاسی بیداری
میں
مولانا محمد علیؒ کا حصہ

از پروفیسر خلیق احمد نظامی، علی گڑھ

یہ مقالہ ۱۶ فروری کو کلکتہ کی محمد علی لائبریری میں مولانا محمد علی جوہر کے سیمینار میں صدارتی خطبہ کے طور پر پڑھا گیا۔ (معارف)

تاریخ کی بعض نامور شخصیتیں، چند اقدار عالیہ کی اس طرح ترجمان بن گئی ہیں کہ ان کا نام لیجئے تو ذہن میں اقدار یک بیک جگمگا اٹھتی ہیں، اور جب ان اقدار کا ذکر کیجئے تو ان کی شخصیت بے اختیار آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے، ایسی ہی ایک شخصیت مولانا محمد علی کی تھی جس کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ حریت، عزیمت اور حق گوئی کو قدرت نے جب مجسم دیکھنا چاہا تو محمد علیؒ کا پیکر دیدیا، انھوں نے بے خوف ہو کر جس طرح برطانوی سامراج کے خلاف آواز اٹھائی، اور ہر قدم پر قید وبند کو لبیک کہا، اس کی دوسری مثال مشکل سے ملے گی۔ ہندوستان نے سیاسی بصیرت، فہم وفراست، تدبر اور مستقل مزاجی، ایثار اور قربانی کے بہت سے نمونے پیش کئے ہیں، لیکن حق گوئی، بے باکی اور سرفروشی میں کوئی شخص مولانا محمد علیؒ کے درجہ کو نہیں پہونچا، ان کا کالبد خاکی اس خمیر سے تیار ہوا تھا جس سے ٹیپو سلطان کا پیکر بنا تھا۔ کہ جب باطل کی قوتوں سے نبرد آزما ہونے کا وقت آئے تو سر کاندھوں پر بوجھ بن جائے، اور خدمت دار ورسن کیلئے دل سینے میں تڑپنے لگے۔ جب مولانا محمد علی نے کہا۔ ؎

پیغام ملا تھا جو حسین ابن علی کو
خوش ہوں وہی پیغام قضا میرے لئے ہو

تو انھوں نے اپنی زندگی کا مقصد اور اپنے دل کی پوشیدہ بے تابیاں بیان کر دی تھیں !

۹ نومبر ۱۹۲۲ء کے ہمدرد میں کس جذب اور کرب کے عالم میں اللہ سے دعا کرتے ہیں۔

"جو فدویت اور جاں فروشی کی روح حسینؓ ابن علیؓ کو اپنے اجداد ابراہیم و اسمٰعیل و محمد صلوٰۃ اللہ علیہم اجمعین سے ملی تھی، اور کرب و بلا کے ریگ زار میں جس کے ظہور کی تو نے اُن کو توفیق دی تھی، اسی عزم و استقلال اور اسی صبر و استقامت کی عاجزانہ درخواست میں بھی کرتا ہوں۔"

جس شخص نے آزادی وطن کے لئے اس طرح اپنی زندگی نثار کر دینے کا عزم کیا ہو، اس کے اعمال کو عام انسانی پیمانوں سے نہیں ناپا جا سکتا۔

۴ جنوری ۱۹۳۵ء کو یوم محمد علی کے موقع پر مولانا ظفر علی خاں نے ایک نظم میں کہا تھا۔

اب تک لگی ہوئی جو کروڑوں دلوں میں ہے ۔۔۔ بیتابی اس لگن کی محمد علی سے تھی

اور اس میں کوئی مبالغہ نہ تھا، مولانا محمد علی نے ایک سوتی ہوئی قوم کو للکارا تھا،

سونے کا نہیں وقت ہشیار ہو غافل ۔۔۔ رنگِ فلکِ پیر زمانے کی ہوا دیکھ

اور جذبات حریت کو ابھار کر ایک قوت بنا دیا تھا، انھوں نے ٹوٹی ہوئی کشتی کے ملاح کی طرح طوفان کا مقابلہ کرتے ہوئے جان دی، بقول مولانا سید سلیمان ندوی۔

"وہ شکست خوردہ فوج کا آخری سپاہی تھا جو اعدا کے نرغے میں تنہا لڑ رہا تھا آخر زخموں سے چور ہو کر ایسا گرا کہ پھر کھڑا نہ ہو سکا۔"

مولانا محمد علی کے وصال کو نصف صدی سے زیادہ گزر چکی لیکن فضاؤں میں آج بھی اُن کی یہ آواز گونج رہی ہے۔

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد ۔۔۔ ہے ابتدا ہماری تیری انتہا کے بعد

قابل مبارک باد ہیں محمد علی لائبریری کے مخلص و پرجوش کارکن جنھوں نے یہ دورِ حیات یاد دلانے کی کوشش کی ہے۔

مولانا محمد علی کی پیدائش ۱۸۷۸ء میں ہوئی تھی، ۱۹۳۱ء میں انھوں نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا، ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں میں شاید ہی کسی لیڈر نے اتنی کم عمر پائی ہو، بایں ہمہ ان کی ۵۳ سالہ زندگی ہندوستان کی تاریخ کا ایک زریں باب ہے، جو کبھی بھلایا نہیں جا سکتا، عوام میں سیاسی شعور کی بیداری، برطانوی سامراج کے خلاف عوامی جد و جہد کا آغاز، اور دستور کی اصلاحات سے متعلق مطالبات کی گوناگوں پیچیدگیوں کا احساس ... تینوں کی ابتدا اسی دور میں ہوئی۔ قوموں کو اپنی آزادی کے حصول کے لیے جس منظم جد و جہد اور قربانی کی ضرورت ہوتی ہے، اور جس کے بغیر ان کی ساری آرزوئیں اور امنگیں بے سود رہتی ہیں، وہ اسی دور میں شروع ہوئی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا محمد علی کی جرأت، عزیمت، حق گوئی اور مجاہدانہ سرفروشی نے ہماری تحریک آزادی میں مقصد کی وہ تپش اور قربانی کا وہ جذبہ پیدا کر دیا جس کے بغیر سامراجی قوتوں کا مقابلہ ممکن نہ تھا، جو شخص اس حسرت کے ساتھ میدان سیاست میں داخل ہوا ہو۔

اک لاش تھی پڑی ہوئی گورِ کفن سے دور ۔۔۔ شاید کہ آج حسرتِ جوہر نکل گئی

اس کے اثرات کا اندازہ کون لگا سکتا ہے! اُن کی رگ رگ سے عمر بھر "من از سرِ نو جلوہ دہم دار و رسن را" کی صدا بلند ہوتی رہی۔

انقلاب فرانس کے ایک مفکر نے لکھا ہے کہ آزادی پہلے ذہن میں قائم ہوتی ہے۔ پھر اس کا ظہور اعمال کے ذریعہ بیرونی دنیا میں ہوتا ہے۔ ہندوستان میں ذہنی آزادی کا اعلان مولانا محمد علی نے کیا۔ اُن کے جذبۂ سرفروشی نے مردہ دلوں کو گرما دیا، اور آزادی کے شورش انگیز مقصد سے ان کی زندگیوں میں ہیجان برپا کر دیا، انھوں نے آزادی کی جنگ کے مفہوم کو عوام تک

پہنچانے کے لئے نہ دلفریب استعارات استعمال کئے، نہ مصلحت اندیشی کو قریب آنے دیا، بلکہ قوم کی روح کے پوشیدہ مضراب کو چھیڑ کر، عزم ہمت اور قربانی کا سبق پڑھایا، غلامی کی زندگی کے مقابلے میں موت کو گلے لگانا سکھایا۔ اور کہا۔ ؎

خاک جینا ہو اگر موت سے ڈرنا ہے یہی — ہوس زیست ہو اس درجہ تو مرنا ہے یہی
اور کس وضع کی جویاں ہیں عروسان بہشت — ہے کفن سرخ، شہیدوں کا سنورنا ہے یہی
نقد جاں نذر کرو سوچتے کیا ہو جوہر — کام کرنے کا یہی ہے تمھیں کرنا ہے یہی

مولانا ابوالکلام آزاد سے جب آپ بیتی لکھنے کا تقاضا ہوا تو فرمایا۔ ؎

گفتی کہ چرا حالِ دل زار نہ گوئی — من خود کنم آغاز بپایاں کہ رساند

وہی سوال مولانا محمد علی سے کیا گیا تو، ۱۸ جون ۱۹۲۷ء کے ہمدرد میں پکار اٹھے۔ ؎

کیا عشق ناتمام کی بتلاؤں سر گذشت — دار ورسن کا دور ابھی انتظار دیکھ

انھوں نے آزادی وطن کی طلب کو ایسا دلفریب بنا دیا تھا کہ کہتے تھے۔ ؎

دے نقد جاں تو بادۂ کوثر ابھی ملے — ساقی کو کیا پڑی ہے کہ یہ مے ادھار دے
ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر — یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

آزادی ہند سے متعلق لٹریچر کو بھی ایک جگہ جمع کرکے اس کا تقابلی مقابلہ کیا گیا تو مولانا محمد علی کی آواز سب سے اونچی اور پرسوز سنائی دے گی۔ !

مولانا محمد علی کی سرگرمیوں کی نوعیت سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ان عوامل اور محرکات کا تجزیہ کیا جائے جن کے زیر اثر ان کے جذبات حریت نے نشوونما پائی تھی۔

(۱) مولانا محمد علی کے جذبات وافکار کی سب سے پہلی تربیت گاہ ام اے او کالج علی گڑھ تھا، یکم مئی ۱۹۲۷ء کے ہمدرد میں لکھتے ہیں،

"۱۸۹۰ء سے ۱۸۹۸ء تک میں علی گڑھ میں رہا، اور تقریباً جو کچھ میں نے حاصل کیا ہے، وہ اسی علی گڑھ کا طفیل ہے:"

یہاں ایک طرف مولانا شبلیؒ کی صحبت میں اسلامی جذبات نے فروغ پایا اور فہم قرآن کی صلاحیت پیدا ہوئی تو دوسری طرف سرسیدؒ کی مقناطیسی شخصیت نے درد قومی کا بے پناہ سرمایہ ایک شورش انگیز مقصد کی طرح ان کی رگ و پے میں دوڑا دیا۔ ۱۹۰۷ء میں انھوں نے اپنی سیاسی جدوجہد کا بنیادی محرک سرسید کو قرار دے کر کہا تھا۔ ؎

سکھایا تھا تم ہی نے قوم کو یہ شور و شر سارا — جو اس کی انتہا ہم ہیں تو اس کی ابتدا تم ہو

(وکیل ۱۱ اپریل ۱۹۰۷ء)

جو لوگ سرسید کی تحریک کے بنیادی مقاصد کو نہیں سمجھ پائے، انھوں نے اس غلط فہمی کو پھیلایا ہے کہ سرسید نے انگریزی غلامی اور سیاسی حقوق کے حصول کی جدوجہد سے علیحدگی کا سبق پڑھایا تھا حقیقتاً سرسید کا خیال اس وقت یہ تھا کہ مسلمانوں کی ترقی کا انحصار ان کی مغربی تعلیم کے حصول پر مبنی ہے اور اگر ابتدا ہی میں سیاست کے خارزار میں پھنس گئے تو قوم کی تعلیمی کوششیں پس پشت پڑ جائیں گی اور پھر کوئی راہ ان کی ترقی کی پیدا نہ ہو سکے گی۔ یہ تجزیہ صحیح تھا، اور بالکل صحیح، اس کی بنیادی سچائی کو جس شخص نے سمجھا ہے وہ پنڈت جواہر لال نہرو تھے، اپنی سوانح حیات میں لکھتے ہیں کہ سرسید کا مسلمانوں کو سیاست سے علیحدگی کا مشورہ اور مغربی تعلیم پر ان کا زور ان کی فکر کی صحیح انقلابی سمت کو ظاہر کرتا ہے (ایک خود نوشت سوانح عمری ۴۶۱-۶۲)

مولانا محمد علی کا خیال بھی یہی تھا لیکن بعد کو جب علی گڑھ کے ارباب حل وعقد نے ملکی سیاست سے علیحدگی پر زور دیا اور ترک موالات کی مخالفت کی تو مولانا محمد علی نے اس زمانہ کے ارباب

اقتدار کی بے حسی اور فقدان بصیرت کا مرثیہ ضرور پڑھا، لیکن سر سید کے متعلق کبھی ان معاندانہ انکار سے اتفاق نہیں کیا بعض حلقوں میں ظاہر کئے جا رہے تھے، نواب وقار الملک نے جو مولانا محمد علی کے سیاسی مرشد تھے، ۱۹۰۳ء میں ایک مضمون میں انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں لکھا تھا۔

"خود جناب سر سید احمد خاں مرحوم و مغفور نے اب سے سالہا سال قبل صاف کہدیا تھا کہ اب وہ وقت نہیں ہے کہ ہم صرف اس انتظار میں بیٹھے رہیں کہ اول اپنی تعلیم کو پورا کریں پھر ملکی معاملات میں قدم رکھیں۔"

مولانا محمد علی نے سر سید کی تحریک کی روح کو سمجھا تھا اور عمر بھر اس کو اپنی زندگی کی عزیز ترین متاع بنا رکھا تھا، انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ قایم کی تو یہ سر سید کے خلاف آواز نہ تھی بلکہ اس دور کے علی گڑھ سے ناامیدی کا اعلان تھا!

اس پس منظر میں دیکھا جائے تو اس حقیقت کے اعتراف میں کوئی تامل نہ ہوگا کہ مولانا محمد علی کی پہلی تربیت گاہ جہاں سے درد قومی اور مسائل ملت کا احساس اُن کو ملا تھا، وہ سر سید کا علی گڑھ تھا!

(۲) دوسرا زبردست اثر مولانا محمد علی پر آکسفورڈ کے قیام کا تھا۔ ایک آزاد ملک کے آزاد علمی مرکز میں ان کا دل اپنے ملک کے حالات پر خون کے آنسو رو دیا تھا۔ یہ حقیقت نظر انداز نہیں کرنی چاہئے کہ ہمارے بعض بہترین رہنما اور مفکر، قیام انگلستان سے وہ جذبات لے کر واپس آئے تھے، جن سے ان کی زندگی میں قوت اور گیرائی پیدا ہوئی، ڈاکٹر محمد اقبال، پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا محمد علی سب نے انگلستان کی آزاد فضا میں اپنے ملک کی آزادی کے خواب دیکھے تھے، اقبال نے طلوعِ اسلام میں بالکل صحیح کہا ہے، ؎

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی

مولانا محمد علی نے جس طرح وہاں کے تعلیمی اداروں کا ذکر کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ

ان کی روح اُس آزاد ماحول کے لیے تڑپتی تھی جو انھوں نے انگلستان کی تعلیمی درسگاہوں میں دیکھا تھا، ۱۹۰۴ء کے ایک رسالے The Proposed Mohammadan University میں جس کو انھوں نے Aligarh Memories کے نام معنون کیا ہے، ان کا تصور یلی اول کے لیکچر روم Cricket ground کے Fenner ' King's chapel اور Cherwell کے Shady Backwaters کی طرف جاتا ہے، اس لئے کہ اس میں ان کو انسانی فطرت قید و بند سے آزاد فطرت سے سرگوشیاں کرتی سنائی دیتی ہے، پنڈت جواہر لال نہرو کا جوش آزادی اور ڈاکٹر محمد اقبال کی مغربی تہذیب اور فلسفہ سے نفرت انگلستان ہی کی دین تھی، مولانا محمد علی کی فکر میں آکسفورڈ کا اثر عمر بھر کام کرتا رہا، وہاں ان کا مضمون تاریخ تھا اور بعض غیر معمولی شہرت کے پروفیسر ان کے استاد تھے، تاریخ کے مطالعہ نے ان کی سیاسی بصیرت کو جلا دی، فکر و نظر کے نئے پیمانے عطا کئے، اور سیاسی حوادث کے پیچھے جو سامراجی اثرات کارفرما تھے، ان کو سمجھنے اور ان سے نبرد آزما ہونے کا جذبہ اور حوصلہ دیا۔

(۳) سر سید کے عطا کئے ہوئے درد قومی اور آکسفورڈ کی عطا کی ہوئی بصیرت نے برطانوی سامراج کو مولانا محمد علی کے سامنے بے نقاب کر دیا۔ اور وہ اس کے مضمرات اور سازشوں کی تہ تک پہونچ گئے، ان کی ولادت سے ایک سال قبل ۱۸۷۷ء میں ملکہ وکٹوریہ نے Empress of India کا لقب اختیار کیا تھا، اور سامراجی منصوبوں اور جد و جہد کا ایک نیا دور شروع ہو گیا تھا۔

مولانا محمد علی نے ۱۹۰۸ء کے نیوز پیپر ایکٹ، ۱۹۰۹ء کی منٹو مورلے ریفارم، ۱۹۱۵ء کے ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ، ۱۹۱۶ء کے سیڈیشن کمیشن پھر ۱۹۱۹ء کے مانٹیگو چیمسفورڈ ریفارم، پھر ۱۹۲۷ء میں سائمن کمیشن کے تقرر میں سامراجی روح کو کارفرما دیکھا تھا، اس

سامراجی ذہن میں "لڑاؤ اور حکومت کرو" کے خطرناک نظریہ پر اپنی ساری کوششوں کی بنیاد رکھی تھی، تقسیم بنگال اور پھر اس کی تنسیخ میں یہی مقاصد کارفرما تھے، مولانا محمد علی نے تمام دستوری اصلاحات اور سیاسی کاوشوں کی سمت کو سمجھ لیا تھا، اور ان کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ آزادی کی تحریک کو مجاہدانہ خطوط پر چلائے بغیر کامیابی ممکن نہیں، مولانا ابوالکلام آزاد کی طرح دہشت پسندانہ تحریکوں سے تو شاید ان کا رابطہ نہیں رہا، ہے لیکن وہ فکر و نظر میں کھلے ہوئے دہشت پسند ہے، اگر مہاتما گاندھی کی عدم تشدد کی تحریک ان کے جوش کی عنان گیر نہ ہو جاتی تو ان کی زندگی کا رخ کچھ اور ہی ہوتا، !

(۴) مولانا محمد علی کے جذبات کی غالباً سب سے بڑی تربیت گاہ ان کی "زندانی زندگی" تھی گو ان کا جوش سرفروشی دار و رسن کو پکارتا تھا، اور وہ کہتے تھے۔ ؎

مستحق دار کو حکم نظر بندی ملا   کیا کہوں کیسے رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی

لیکن حقیقت یہ ہے کہ قید و بند کی زندگی نے اُن کے ساتھ وہی عمل کیا جو امام احمد بن حنبلؒ، امام ابن تیمیہؒ اور مجدد الف ثانیؒ کے ساتھ کیا تھا، انھوں نے جیل کی تنگ و تاریک کوٹھریوں میں اللہ کی یاد سے اپنے نہاں خانۂ دل کو روشن کیا، اور پھر اس سے وہ قوت اور روشنی حاصل کی کہ بے اختیار پکار اٹھے۔ ؎

اب ہوا ہے ماسوا کا پردہ فاش   معرفت کے اب کہیں دفتر کھلے
فیض سے تیرے ہی اے قید فرنگ   بال و پر نکلے، قفس کے در کھلے

جو جیل خانہ میں اپنی چہیتی بیٹی آمنہ کی شدید علالت کی خبر کو سن کر کہنے لگے۔ ؎

تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اس کو   نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں

وہ جذبات کے کس قلزم سے گزر کر صبر و رضا کی اس منزل پر پہنچا ہو گا، اور کس عالم میں اس نے اللہ سے دعا کی ہوگی۔

شان قدرت مجھے دکھلا کہ ہو تسکین کا نزول   دل جو ہر ہے، یہ یارب جیل طور نہیں

اللہ کی ذات پر پورا بھروسہ، حق کے لیے جان دینے کا جذبہ ان کو جیل خانہ کی تنہائی سے ملا اور اس کے سہارے انھوں نے اپنی سیرت کو سنوارا اور اس میں وہ دلنوازی پیدا کی جو خالق کائنات سے رشتہ جوڑنے والے ہی کی میراث ہے۔ ؎

قید اور قید بھی تنہائی کی   شرم رہ جائے شکیبائی کی
کر گئی زندۂ جاوید ہمیں   تیغ قاتل نے مسیحائی کی

مولانا محمد علی کی فکر اور جذبات کا کوئی مطالعہ ان کے جیل خانے جانے سے پہلے اور اس کے بعد کی زندگی کے زبردست فرق کا تجزیہ کیے بغیر ممکن نہیں۔

۵۔ مولانا محمد علی کے قیام انگلستان نے ان کو عالم اسلام کے حالات اور مغربی استعمار کے عزائم سے واقف کر دیا تھا، یورپ کے "مرد بیمار" کی جان کنی مغربی طاقتوں کی للچائی ہوئی نظروں، اسلامی طاقت کو پارہ پارہ کر دینے کے عزائم، طرابلس کی جنگ، بلقان کی بغاوت، سب کو انھوں نے حقیقی تاریخی پس منظر میں دیکھا، اور ان کو اسلام کی عالمگیر بربادی میں انگریز کی سازشوں کا احساس ہونے لگا، مولانا شبلیؒ کا یہ شعر وہ رو رو کر پڑھا کرتے تھے۔

کہاں تک لوگے ہم سے انتقام فتح ایوبی   دکھاؤ گے ہمیں جنگ صلیبی کا سماں کب تک!

لیکن جب ونسٹن چرچل نے قسطنطنیہ پر حملہ کے وقت اعلان کیا۔ (ہم آخری اور بہترین صلیبی جنگ لڑ رہے ہیں)

یہ جملہ ایک نشتر کی طرح مولانا محمد علی کے قلب کی گہرائیوں میں اتر گیا، اور عثمانیوں کے سیاسی اقتدار کو ختم کرنے کی کوشش میں ان کو اسلام کے خلاف مغربی سازش اپنے پورے

عواقب اور نتائج کے ساتھ نظر آنے لگی، خلافت کچھ نہ ہونے کے باوجود بھی بہت کچھ تھی،
یہ ایک نشانی تھی جو منزلِ مقصود کی طرف اشارہ کرتی تھی، کارواں بھٹک چکا تھا، راہ
گرد و غبار سے اَٹ گئی تھی، لیکن یہ نشان راہ پکار رہا تھا۔ ؎

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

اس "قلب و جگر" کی تلاش میں خود ان کا دل "قاش صد پارہ" بن گیا، لیکن وہ جنس نایاب
کہیں نہ ملی، اور جب مصطفےٰ کمال نے خلافت کے خاتمے کا اعلان کیا تو وہ عرفی کے اس
شعر کی مجسم تفسیر بن گئے۔ ؎

تو اچہ آگہی کہ مرا از غروب ایں خورشید
چہ گنج ہائے سعادت زیاں جاں آمد

انھوں نے خلافت کے تصور سے ہندوستان کی تحریک آزادی کو تاب و توانائی
بخشی۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ وہ ہندوستان کی سیاسی جد و جہد اور خلافت کی بقا کے لئے
تحریک کو ایک ہی رشتہ میں پرونے لگے تھے، تو غلط نہ ہوگا۔ خلافت ڈیلیگیشن کے مقاصد پر بحث
کرتے ہوئے، ایک حالیہ تصنیف میں یہ جملہ بڑا قابل غور ہے :۔

From an examination of the Delegation's activities
utterances and writings it is evident that they had
gone to Europe not only to plead the cause of Khilafat
but through this medium to advance the nationalist
movement in India".

N.Qureshi "Mohd Ali's Khilafat Delegation to Europe."
Karachi 1980. p.63

یہ ہیں وہ پانچ بنیادی محرکات جن کے زیر اثر مولانا محمد علی کی سیاسی فکر نے نشو و نما پائی تھی،
اس مختصر تجزیہ کے بعد ان کے بنیادی سیاسی تصورات پر ایک نظر ڈال لی جائے تو ان کے کام
کی صحیح سمت متعین کرنا زیادہ آسان ہو جائے۔

۱۔ مولانا محمد علی کے دل میں ہندوستان سے گہری محبت تھی، فرقہ واریت کی پرچھائیاں
بھی ان کی فکر پر نہیں پڑی تھیں، وہ ہندو مسلمان کو ایک رشتۂ الفت میں بندھا ہوا دیکھنا چاہتے
تھے، مہاراجہ بڑودہ اور مہاراجہ الور نے ان سے جو سلوک کئے تھے، وہ تمام عمر نہیں بھولے، انھوں
نے مہاتما گاندھی کو جس طرح اپنا رہبر تسلیم کر لیا تھا، اور ان کی قیادت میں اپنی مذہبی تحریک
یعنی خلافت کو چلایا تھا، اس سے اُن کے انداز فکر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ اسلام مولانا محمد علی کی شخصیت کا مرکزی نقطہ تھا، وہ اسلام سے تعلق کو اپنے لئے
باعث فخر سمجھتے تھے، انھوں نے اسلام اور اپنی وطن دوستی میں کبھی کوئی تصادم محسوس نہیں کیا
جن لوگوں نے ان دونوں جذبات کو مختلف سمتوں میں کار فرما دکھایا ہے، انھوں نے مولانا محمد علی
کے ساتھ انصاف نہیں کیا، حقیقت یہ ہے کہ اس تناقض پر زور ان طبائع کی ستم ظریفی ہے،
جن میں سچائی کی کمی ہے اور منافقت کا جذبہ جن کا رہبر ہے، گول میز کانفرنس کے چوتھے اجلاس
میں، ۱۹ نومبر ۱۹۳۰ء کو اپنی آخری تقریر کرتے ہوئے مولانا محمد علی نے کہا تھا۔

"جہاں تک احکام خداوندی بجا لانے کا تعلق ہے میں اول بھی مسلمان ہوں،
دوئم بھی مسلمان ہوں اور آخر میں بھی مسلمان ہوں، یعنی میں مسلمان ہونے کے علاوہ
اور کچھ نہیں ہوں . . . . . اور یہی حال ڈاکٹر مونجے کا ہے، احکام خداوندی کی بجا آوری
میں ان کو پہلے ہندو ہونا چاہئے، اور مجھ کو مسلمان، لیکن جہاں ہندوستان کا سوال
آتا ہے، جہاں ہندوستان کی آزادی کا سوال آتا ہے، یا جہاں ہندوستان کی فلاح

وجود کا سوال آتا ہے، میں اول بھی ہندوستانی ہوں، دوئم بھی ہندوستانی ہوں اور آخر میں بھی ہندوستانی ہوں، اور ہندوستانی ہونے کے علاوہ کچھ نہیں ہوں، میں دو دائرے کے دائروں سے تعلق رکھتا ہوں جو ہم مرکز نہیں ہیں"۔

۳۔ بعض اوقات مولانا محمد علیؒ کے مذہبی جذبے کو مذہبی تنگ نظری سے تعبیر کیا جاتا ہے، یہ خیال بھی غلط اور گمراہ کن ہے، ان کی فکر میں مذہبی جذبات اخلاق و انسانیت کی معراج بن کر داخل ہوئے ہیں، ایسا اخلاق جو کائنات کے ہر ذی روح کے ساتھ انصاف کر سکے اور ایسی انسانیت جو "الخلق عیال اللہ" کی تفسیر بن جائے، ان کا عقیدہ تھا۔

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اقبال کے اس مصرعہ کو نقل کرکے انھوں نے اپنی فکر کی وضاحت بھی کی ہے

۴۔ مولانا محمد علی نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ کانگریس سے گہرے تعلق میں گذارا تھا، مہاتما گاندھی کو جس طرح انھوں نے اپنا رہبر تسلیم کیا، اور ان کی سرکردگی میں سیاسی تحریک کو آگے بڑھایا، اس سے ان کے سیاسی مسلک کی ترجمانی ہوتی ہے، وہ کانگریس کے صدر بھی رہے اور پنڈت جواہر لال نہرو نے ان کے سکریٹری کی حیثیت سے کام بھی کیا، پنڈت نہرو کے نام انکے خطوط سے نہرو خاندان سے گہرے قلبی تعلقات بے لاگ آزادانہ بیباکانہ خیالات اور بے پناہ خلوص کا اندازہ ہوتا ہے۔

جن اسباب کی بنا پر مولانا محمد علی کانگریس اور اس کی لیڈرشپ سے دور ہو گئے، اس کا تجزیہ ضروری ہے، لیکن آسان نہیں، اگر مولانا ابوالکلام آزاد ۱۹۵۸ء تک اپنے بعض افکار و نظریات کا تجزیہ عوام تک پہونچانا نہیں چاہتے تھے، اور انڈیا ونس فریڈم کے کچھ اجزا کو انھوں نے ۳۰ سال کے لیے سربمہر نیشنل آرکائیوز میں رکھوانا ضروری سمجھا تھا تو یاد رکھئے کہ مولانا محمد علیؒ کے افکار کے کشف و تحقیق کے لیے بھی شاید اس سے زیادہ ہی وقت درکار ہو گا فرقہ واریت کی

سیاست، اور تقسیم ہند کے اثرات نے جو ذہنی ماحول پیدا کر دیا ہے، اس میں بہت سے سیاسی واقعات کا معروضی مطالعہ ممکن نہیں رہا ہے۔ لیکن دیانت داری کا تقاضا ہے کہ ان حقائق سے کبھی چشم پوشی نہ کی جائے۔ (۱) مولانا محمد علی کا بے پناہ جذبۂ آزادی، اور (۲) ہندوستان میں فرقہ وارانہ اتحاد اور یکجہتی کے لئے ان کی پرخلوص جد وجہد اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ فروعی حیثیت رکھتا ہے، اور اس کا تجزیہ جس ذہنی فضا کا مطالبہ کرتا ہے وہ ابھی برصغیر میں پیدا نہیں ہوئی۔

۵۔ مولانا محمد علی میں مذہبیت کا غلبہ ان کی زندگی کے حقائق کی پیداوار تھا، ان کا جوش آزادی، ناپیدا کنار سمندر کی طرح موجیں مارتا تھا، ان کے حالات زندگی ایک جوئے تنک آب میں اس کو ڈال دیتے تھے، انھوں نے سیاسی زندگی کے عروج اور زوال دونوں کی کیفیت دیکھی تھی، ان کے اقتصادی حالات ان کے ارادوں کو شکست نہ دے سکے تھے، لیکن ان کے جسم کو چکنا چور کر دیا تھا، مذہب کے سہارے انھوں نے اپنی دکھتی ہوئی کمر کو آرام پہنچایا تھا، اور اپنے زخمی دل کا مداوا تلاش کیا تھا۔ ۱۰ اکتوبر ۱۹۲۶ء کے ہمدرد میں لکھتے ہیں: "نظربندی کے مصائب اور نظربندی ہی کی فرصت نے مجھے پہلی بار سارے قرآن سے آشنا کرایا"۔

۶۔ مسلمانوں کے مقامات مقدسہ پر برطانوی سامراج کی للچائی ہوئی نظروں کو مولانا محمد علی نے پہچان لیا تھا، لائڈ جارج کو ممبران خلافت ڈیلیگیشن کی جانب سے ۱۰ جنوری ۱۹۲۰ء کو جو خط انھوں نے لکھا ہے، اس میں دو مطالبے کئے ہیں،

(i) Territorial integrity and Political Independence of the Empire of the Khalifa and (ii) the inviolability of Jazirat -ul-Arab the Holy land of Islam" (Unpublished letters of Ali Brothers P.202

وہ مسلمانوں کے ملی وجود کا انحصار مقامات مقدسہ کے تحفظ پر سمجھتے تھے، اقبال کی طرح ان کا احساس بھی یثرب کے متعلق یہ تھا۔

جب تلک باقی ہے تو دنیا میں باقی ہم بھی ہیں صبح ہے تو اس چمن میں گوہر شبنم بھی ہیں

۔ آزادیٔ فکر و ضمیر محمد علی کی فطرت کا تقاضا تھا۔ وہ اپنے نظریات کو کسی مصلحت کے تابع نہیں کر سکتے تھے، وہ بادشاہ، سیاسی رہبر، استاد اور پیر سب کے سامنے اپنی خودی، اور اپنے فکر کی آزادی برقرار رکھتے تھے۔

مہاتما گاندھی سے اختلاف ہوا، تو اس کے اظہار میں تامل نہ کیا، اور جب اپنے مرشد مولانا عبد الباری فرنگی محلیؒ سے رائے کا اختلاف ہوا، تو اس کو بھی پوشیدہ نہ رکھ سکے۔ پروفیسر مارگولیتھ ان کا استاد تھا، لیکن اس کی Life of Mahomet پر ان کی برہمی قابل دید تھی۔ اُن کے مزاج پر نظر رکھے بغیر ان کی شخصیت کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ ان کے یہاں جذبات، فکر، زبان تینوں میں مکمل ہم آہنگی تھی، وہ سیاست میں رہتے ہوئے بھی سیاسی آدمی نہیں تھے، ان کے اعمال میں جذبات کی کارفرمائی زیادہ اور فکر کی جلوہ گری کم ہوتی تھی، یہ ان کی سرشت کا تقاضا تھا، ممکن ہے کہ اُن کے دماغ نے کسی جگہ غلطی کی ہو، لیکن ان کا دل ہمیشہ سچائی، خلوص اور عزیمت کا مرکز رہا۔

ان محرکات اور افکار کی بنیادی سمت کو ذہن میں رکھ کر اگر ان کی سیاسی کاوشوں اور جد و جہد کا تجزیہ کیا جائے تو ان کی شخصیت کی دل گیری اور ان کے افکار کی بلندی کا صحیح اندازہ ہو سکے، محمد علیؒ کی شخصیت انسانیت حب الوطنی، اور آزادیٔ فکر سے بنی تھی، ان کی سیاسی زندگی کے اہم کارناموں کا سرسری جائزہ بھی جو تفصیل چاہتا ہے، وہ ایک مضمون میں ممکن نہیں، یہاں صرف چند اہم واقعات کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرا کر آپ سے رخصت چاہوں گا۔

مولانا محمد علی کے ان خطوط سے جو گوکھلے کے نام ۱۹۰۷ء اور ۱۹۰۸ء میں لکھے گئے ہیں، یہ حقیقت پوری طرح آشکارا ہو جاتی ہے کہ وہ گوکھلے کے ذریعہ علی گڑھ کو قومی سیاست کے میدان میں لانے کے لیے بے چین تھے، بعض اوقات گوکھلے سے کہتے تھے، کہ مسلمانوں کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش ضروری ہے، ایک خط میں لکھتے ہیں۔

Do'nt you think that an effort should be made to understand the Mohommadan point of view.

(Shan Muhammad unpublishedletters of Ali Brothers Delhi 1979)

اسی طرح کے افکار و نظریات کو لے کر وہ کلکتہ پہونچے۔

کلکتہ بجا طور پر فخر کر سکتا ہے کہ ہندی مسلمانوں کے دو عظیم الشان جریدے، جنھوں نے تحریک آزادی میں شاندار رول ادا کیا ہے، یعنی الہلال اور کامریڈ اسی سرزمین سے نمودار ہوئے تھے، یہاں سے آزادی کی آواز بلند کی گئی تھی، ۱۴ جنوری ۱۹۱۱ء کو کامریڈ کا پہلا پرچہ مولانا محمد علی کے کلکتہ میں قدم رکھنے کے دس دن بعد منظر عام پر آ گیا تھا، ۲۳ مئی ۱۹۲۳ء کے ہمدرد میں کامریڈ کے متعلق لکھتے ہیں،

"بے جا تعلی نہ ہوگی اگر ہم کہیں کہ یہ کامریڈ ہی کا طفیل تھا کہ ۱۹۱۱ء سے لے کر ۱۹۲۱ء تک مسلمانان ہندوستان بتدریج ایک ہی قومی پالیسی پر متفق ہو گئے تھے اور وہ پالیسی خود بتدریج ترقی کرتے کرتے انھیں خلافت کی بقا و احیا اور ہندوستان کی آزادی و سوراج کے مطالبے تک لے آئی"

ترکی، بلقان اور طرابلس کے حالات و حوادث نے مولانا محمد علی کی روح کو تڑپا دیا تھا، جب انھیں معلوم ہوا کہ Bulgarians استنبول سے ۲۵ میل دور رہ گئے ہیں تو انھوں

نے خودکشی کا ارادہ کر لیا تھا، ایک دوست کی بروقت مداخلت سے وہ اس سے باز رہے، لیکن غم ان کی رگ رگ میں اتر گیا، انھوں نے اکتوبر ۱۹۱۲ء اور نومبر ۱۹۱۲ء کے کامریڈ میں The Last Fight of the Turks جو مضامین The Sacrifice The Crescent and the Cross کے عنوان سے لکھے ہیں ان سے مسلمانوں کے جذبات میں ایک ہل چل مچ گئی یہی زمانہ تھا، جب اقبال بارگاہ رسالت میں ایک آبگینہ لے کر حاضر ہوئے تھے۔ ؎

جھلکتی ہے تیری امت کی آبرو اس میں ~ طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

مولانا محمد علی کا اپنا دل خون ہو چکا تھا، مارچ ۱۹۱۳ء کو انھوں نے انجمن خدام کعبہ کی بنیاد ڈالی اور ان کی سرگرمیوں کا نیا دور شروع ہوا، ترکی کے اعلان جنگ کے بعد مولانا محمد علی نے ایک مضمون Choice of The Turks (یعنی ترکوں کا انتخاب) لکھا اور برطانوی وزارت خارجہ کی نیندیں حرام کر دیں، عرصہ تک رام پور، مہرولی، دہلی، چھندواڑہ، بیتول کے جیل خانوں میں رہے اور عزیمت و حق گوئی کی ان سنتوں کو تازہ کر دیا جن پر انسانیت کی بقا کا مدار ہے۔

۳۰ دسمبر ۱۹۱۹ء کو جلیان والا باغ کے مظالم کا امرت سر کانگریس کے اجلاس میں اس طرح ذکر کرتے ہیں۔

”جلیان والا باغ میں جو لوگ جمع تھے، گولیاں ان پر نہیں چلائیں، بلکہ ہمارے دلوں پر گولیاں چلائی ہیں، اس نے ایک نئی آگ بھڑکا دی ہے، جس میں ہندو مسلمانوں کی ایک نئی قوم پیدا ہو رہی ہے، اس نے ایک ایسی نئی قوم پیدا کی ہے، جو انشاء اللہ تعالیٰ روئے زمین پر کسی سے خوف نہیں کھائے گی۔“

مولانا محمد علی کا عقیدہ تھا کہ برطانوی استبداد کے خلاف متحدہ جدوجہد ہندو مسلمان کو

ایک ایسے رشتہ میں پرو دے گی جو ناقابل شکست ہوگا، اسی تقریر میں انھوں نے کہا۔

”میں کہتا ہوں کہ میرا سب سے اعلیٰ بادشاہ خدا ہے، اور خدا نے مجھ کو ویسا ہی آزاد پیدا کیا ہے، جیسا کہ جارج پنجم کو۔“

پھر آزادی کی آواز اور بلند ہوتی ہے، اور کہتے ہیں۔

”مجھ کو جیل جانے دو، مسٹر تلک اگر ضرورت ہو تیسری بار جیل خانے بھیج دیے جائیں، مسز اینی بیسنٹ دوبارہ نظر بند کر دی جائیں، بلکہ اس بڑھاپے میں اگر ضرورت ہو تو اپنے ہی بالوں سے پکڑ کر انھیں پھانسی دے دی جائے، لیکن ہندوستان کو آزاد ہونے دیجیے، تاکہ آیندہ کوئی شخص کسی ہندوستانی مرد عورت کو نہ کہہ سکے کہ تو پیدائشی غلام ہے۔“

جب ۱۶ اپریل ۱۹۱۹ء کو رولٹ ایکٹ کے خلاف تقریر میں انھوں نے مہاتما گاندھی کی سیاسی رہبری کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے طوق غلامی کو اتار پھینکنے کا اعلان کیا، جب ترک موالات اور سودیشی کی تحریک کا آغاز ہوا تو محمد علی کی یہ گرجدار آواز فضاؤں میں گونج اٹھی۔

”صلوٰۃ عشق کا وضو خون سے ہوتا ہے، آپ سوراج کے سچے عاشق ہیں تو اس نماز کا وضو کرنے کے لیے اپنی آرام طلبی و تن آسانی کا خون کریں، آپ کے بدن پر جو تنزیب اور ڈوریا ہے، اس کو اتار کر پھینک دیں۔ یہی چیز ہے، جس کی قیمت سے وہ قوت پیدا ہوتی ہے جس نے امرتسر میں آپ کے بھائیوں کو پیٹ کے بل چلوایا۔ آپ کہتے ہیں کہ کھدر میں گرمی لگتی ہے۔ قرآن کریم میں دوزخ کا ذکر یاد کرو اور دوزخ کی آگ سے ڈرو جو اس سے کہیں زیادہ گرم ہے، میں بمبئی میں خواتین سے کہہ آیا ہوں کہ تم گاڑھے کی ساڑی پہننے سے گھبراتی ہو، شاید ایک وقت آئیگا کہ تم کو اپنی کھال اتار کر ملک کے لیے دینی ہوگی۔“

مولانا محمد علیؒ نے مہاتما گاندھی کی سودیشی تحریک کو ایک حرکت اور ایک گرمی عطا کی اور چھوٹے بڑے ہر ایک کے دل میں ایک نیا جذبہ اور ولولہ آزادیٔ وطن کا پیدا کر دیا، مولانا محمد علیؒ ہی کے اصرار پر سی، آر۔ داس نے اپنی پریکٹس ترک کی۔ یکم اپریل ۱۹۲۱ء کو مولانا محمد علیؒ نے ایک کروڑ رضا کار تحریک ترک موالات کے لیے اور ایک کروڑ روپیہ کی تلک میموریل فنڈ کے لیے اپیل کی۔ (Afzal Iqbal: Life & Times of Mohammad Ali (P.250)

حقیقت یہ ہے کہ قومی تحریک میں مولانا محمد علیؒ نے جس خلوص، انہماک اور جذبۂ سرفروشی کے ساتھ شرکت کی اس کو کوئی دیانت دار مورخ فراموش نہیں کر سکتا۔

جب تک کانگریس سے تعلق رہا، نہایت خلوص اور احترام کے ساتھ مہاتما گاندھی کی پیروی کی۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کا بیان ہے کہ کراچی سے بیجاپور جیل جاتے ہوئے کسی اخبار کے نمائندے نے تحریک ترک موالات کے متعلق معلوم کیا تو جواب دیا کہ تحریک کا حال تو وہ لوگ بتا سکتے ہیں، جو باہر ہیں، لیکن اتنا ضرور ہے کہ وہ خود احکام رسولؐ کے بعد، گاندھی جی کے کہنے پر عمل کرتے ہیں۔ (ذاتی ڈائری ج ۱ ص ۱۰۰)

مولانا ابوالکلام آزاد نے پیغام میں جو مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی ادارت میں کلکتہ سے نکلتا تھا، مولانا محمد علی کی گرفتاری پر ایک پیغام شائع کرایا تھا، اس میں کہا تھا (۲۳ ستمبر ۱۹۲۲ء)

"ان کی گرفتاری ہمارے لئے کوئی غم نہیں ہے، البتہ ان کی عزت پر رشک ہے،
.... وہ ہم سے بازی لے گئے۔"

اور یہ صحیح تھا، ان کو اپنے جذبات سرفروشی اور عزیمت کی بنا پر اپنے معاصرین پر فوقیت حاصل ہو گئی تھی۔

وہ کس طرح ہندوؤں اور مسلمانوں کو ساتھ لے کر چلنا چاہتے تھے، اس کا اندازہ ان کی

۲۰ اکتوبر ۱۹۲۰ء کی تقریر سے لگایا جا سکتا ہے۔ لاہور میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ خلافت کا مسئلہ صرف مسلمانوں کا نہیں ہے، ہندوؤں کا بھی ہے۔

"اگر تمہیں آریاورت اور بھارت ماتا سے محبت ہے تو اس پاس کے ملکوں اور ان پڑوسی کی سلطنتوں کی آزادی کو بچانے کی کوشش کرو جنھوں نے کسی طرح اب تک اپنی آزادی برقرار رکھی ہے، ورنہ یاد رکھو تمہارے پاؤں کی بیڑی اور بھی بوجھل ہو جائے گی۔"

یہ حقیقت مہاتما گاندھی کی سیاسی بصیرت نے پوری طرح دیکھ لی تھی، اور انھوں نے خلافت کے سہارے آزادی کے جذبات کو بیدار کرنے اور تحریک آزادی کو آگے بڑھانے کا کام لیا تھا۔ ۱۹۲۱ء میں آل انڈیا خلافت کمیٹی کے کراچی سیشن میں مولانا محمد علیؒ نے مسلمان سپاہیوں کو انگریزی فوج سے علیحدگی اختیار کرنے کا مطالبہ کیا۔

خلافت تحریک میں جب ہندو مسلمانوں کے اتحاد نے سامراجی مفاد کو مجروح کیا تو فرقہ وارانہ اختلافات کو بھڑکانے کی کوششیں تیز تر کر دی گئیں، جب مولانا محمد علیؒ اور شوکت علی جیل بھیجے گئے، تو مہاتما گاندھی نے ہندو مسلمانوں کو اتحاد قائم رکھنے کی تلقین کی، لیکن جب علی برادران جیل سے باہر آئے تو ملک میں فرقہ وارانہ منافرت کے بیج بوئے جا چکے تھے، اور فساد کی فضا عام تھی۔ دونوں بھائیوں نے فرقہ وارانہ اتحاد اور یک جہتی کی طرف اپنی ساری صلاحیتوں کو ڈال دیا، اور اس میں کچھ حد تک کامیاب بھی ہوئے، مولانا محمد علیؒ کی خدمات کا اعتراف ان کو انڈین نیشنل کانگریس کے ۳۸ ویں اجلاس منعقدہ کوکناڈا کا صدر منتخب کر کے کیا گیا، ان کا خطبۂ صدارت آزادیٔ وطن اور فرقہ وارانہ یک جہتی کی ایسی آواز تھی، جس نے ہر ہندوستانی کے دل کو متاثر کیا۔

۱۹۲۳ء کے بعد آل پارٹیز کانفرنسیں منعقد ہوئیں، تاکہ کوئی متحدہ زاویۂ نگاہ دستور کی ترتیب و تدوین میں بروئے کار لایا جا سکے۔ نہرو رپورٹ سے وہ غیر مطمئن تھے،

گول میز کانفرنس میں انھوں نے اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ پر زور دیا، انھوں نے اپنے ضمیر سے کبھی صلح نہیں کی، ممکن ہے کہ ان کے دماغ سے کہیں چوک ہوئی ہو لیکن ان کا دل پاک، اور انکی فطرت پاکیزہ تھی، انسان دوستی، حب الوطنی اور سرفروشی مولانا محمد علیؒ کی شخصیت کے جوہر تھے، سچ تو یہ ہے کہ

سالہا گوشِ جہاں زمزمہ زا خواہد بود زیں نوا ہا کہ دریں گنبد گردوں زدہ است

بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ مولانا محمد علیؒ بڑے ضرور تھے، لیکن ان کا کوئی کارنامہ نہیں ہو۔ یہ تنگ دلوں اور تنگ نظروں کا فیصلہ ہے، اس کا جواب پروفیسر رشید احمد صدیقی کے الفاظ میں یہ دیا جاسکتا ہے کہ مرد غازی کے کارنامہ کا اندازہ مقبوضات کی وسعت، مال غنیمت کی فراوانی جشن وجلوس کی ہماہمی وطرب انگیزی، تمغہ اور اسلحہ کی چمک اور جھنکار سے نہیں کیا جاتا، بلکہ اس کا اندازہ کیا جاتا ہے ٹوٹی ہوئی تلوار، بکھری ہوئی زرہ، بہتے ہوئے لہو، دہکتی ہوئی روح اور دمکتے ہوئے چہرہ اور ڈوبتے ہوئے سورج سے" (گنج ہائے گراں مایہ ص ۸)

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

فارم ۱۷

دیکھو رول نمبر ۸

معارف پریس اعظم گڈھ

نام مقام اشاعت	:-	دار المصنفین اعظم گڈھ
نوعیت اشاعت	:-	ماہانہ
نام پرنٹر	:-	سید اقبال احمد
قومیت	:-	ہندوستانی
پتہ	:-	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام پبلشر	:-	
اڈیٹر	:-	سید صباح الدین عبد الرحمٰن
قومیت	:-	ہندوستانی
نام و پتہ مالک رسالہ	:-	دار المصنفین اعظم گڈھ

میں اقبال احمد تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں، وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔ سید اقبال احمد

اسلامی تمدن میں علم کی روایت اور اس سے متعلقہ مسائل

از ڈاکٹر نذیر احمد، علی گڈھ،

اسلام میں علم اور علماء کا درجہ نہایت افضل قرار دیا گیا ہے، چنانچہ قرآن کریم و احادیث نبویؐ میں علم کی عظمت اور علما کے بلند مرتبے کے بارے میں تاکید ہے۔

امام محمد غزالی کی احیاء العلوم میں پہلی کتاب، کتاب العلم ہے، جس کا پہلا باب: علم تعلم اور تعلیم کے فضائل میں ہے، امام صاحب نے علم کی فضیلت میں قرآن مجید کی متعدد آیات اور حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث نقل کی ہیں، ان میں چند یہاں پیش کی جاتی ہیں۔

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ (قرآن ۳/۱۸)

خدا تو اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتے اور علم والے لوگ جو انصاف پر قائم ہیں وہ بھی گواہی دیتے ہیں۔

اس آیت میں پہلے خدا کی گواہی ہے، پھر ملائکہ کی اور آخر میں اہل علم کی، لیکن ذیل کی آیت میں اہل علم کو دوسرے درجے پر رکھا ہے۔

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ۔ (قرآن ۱۳/۴۳)

کہہ دو کہ میرے اور تمھارے درمیان خدا اور وہ شخص جسکے پاس کتاب (آسمانی) کا علم گواہ کافی ہے۔

آیت ذیل میں اللہ کے ذکر کے بعد راسخین علم کا ذکر آیا ہے۔

وَمَا یَعْلَمُ تَاوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ (قرآن ۳/۷)

حالانکہ مراد اصلی اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور جو لوگ علم میں دستگاہ کامل رکھتے ہیں کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے

ذیل کی آیت قابل توجہ ہے۔

یَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ (قرآن ۵۸/۱۱)

جو لوگ تم میں سے ایمان لائے ہیں اور جن کو علم عطا کیا گیا ہے، خدا ان کے درجے بلند کرتا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ علما رمومنوں سے سات سو درجے آگے ہیں، اور ایک درجے سے دوسرے درجے تک پانچ سو سال کا فاصلہ ہے۔

اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا۔ (قرآن ۳۵/۲۸)

خدا سے تو اس کے بندوں میں سے ڈرتے ہی ہیں جو صاحبِ علم ہیں۔

موید بن محمد جاجرمی مترجم فارسی احیاء فرماتے ہیں، عربی میں انما کا تقاضا حصر ہے پس اس آیت کا مقتضٰی یہ ہے کہ خشیت سوائے علما کے کسی اور میں پائی ہی نہیں جاسکتی۔

قَالَ الَّذِیْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِیْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْكَ طَرْفُكَ (قرآن ۲۷/۴۰)

ایک شخص جس کو کتاب الٰہی کا علم تھا کہنے لگا کہ میں آپ کی آنکھ جھپکنے سے پہلے پہلے اسے آپ کے پاس حاضر کئے دیتا ہوں۔

دراصل اتنی پھرتی سے (یعنی پلک جھپکنے سے قبل) لانے کا موجب صرف اس کا علم تھا۔

وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا یَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ (قرآن ۲۹/۴۳)

اور ہم یہ مثالیں لوگوں کے (سمجھانے) کے لئے بیان کرتے ہیں، اور اسے تو اہل دانش ہی سمجھتے ہیں۔

مثالیں تو عمومی طور پر عام لوگوں کے لئے ہیں، لیکن اس کے صحیح مفہوم و مقصود کا ادراک علمار کے لئے مخصوص ہے۔

وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَی الرَّسُوْلِ وَاِلٰۤی اُولِی الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِیْنَ یَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ۔ (قرآن ۴/۸۳)

اور اگر یہ لوگ اسکو رسول کے اور جو ان میں ایسے امور کو سمجھتے ہیں، ان کے حوالہ رکھتے تو اس کو وہ حضرات تو پہچان ہی لیتے جو ان میں اس کی تحقیق کر لیا کرتے۔

واقعات کے حکم کا استنباط علماء سے متعلق ہے، خدائے عزوجل کے حکم کے بیان میں ان کا مرتبہ انبیا علیہم السلام سے مل گیا ہے۔

اب چند احادیث ملاحظہ ہوں۔

اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْاَنْبِیَاءِ

علمار انبیار کے وارث ہیں۔

جس طرح کوئی مرتبہ پیغمبری کے برابر نہیں، اسی طرح کوئی درجہ وراثت پیغمبری سے بڑھ کر نہیں ہوسکتا۔

اَلْاِیْمَانُ عُرْیَانٌ فَلِبَاسُهُ التَّقْوٰی وَزِیْنَتُهُ الْحَیَاءُ وَثَمَرَتُهُ الْعِلْمُ

ایمان برہنہ ہے، پرہیزگاری اس کا لباس، اور شرم آرائش، اور علم اس کا ثمرہ ہے،

انسانیت کا کمال انکشاف حقائق پر موقوف ہے۔

اَقْرَبُ النَّاسِ مِنْ دَرَجَةِ النُّبُوَّةِ اَهْلُ الْعِلْمِ وَالْجِهَادِ۔

لوگوں میں نبوت کے درجے سے زیادہ قریب اہل علم اور اصحابِ جہاد ہیں،

فضیلتِ علم

لَمَوْتُ قَبِيلَةٍ أَيْسَرُ مِنْ مَوْتِ الْعَالِمِ۔	ایک عالم کی موت پورے قبیلہ کی موت سے زیادہ سخت ہے۔
يُوزَنُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِدَادُ الْعُلَمَاءِ وَدَمُ الشُّهَدَاءِ (وَفِي رِوَايَةٍ) فَيَرْجَحُ مِدَادُ الْعُلَمَاءِ عَلَى دَمِ الشُّهَدَاءِ	قیامت کے دن علماء کے قلم کی سیاہی اور شہداء کے خون تولے جائیں گے۔ (دوسری روایت میں ہے) اس وزن میں علماء کے قلم کی سیاہی کو شہداء کے خون پر
فَضْلُ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ كَفَضْلِي عَلَى أَدْنَى رَجُلٍ مِنْ أَصْحَابِي۔	عالم کو عابد پر وہی فضیلت ہے جو مجھے میرے اصحاب رسول میں سے عام آدمی پر
فَضْلُ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ كَفَضْلِ الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ عَلَى سَائِرِ الْكَوَاكِبِ۔	عالم کی عابد پر وہی فضیلت ہے جو چودھویں کے چاند کو سارے ستاروں پر۔
فَضْلُ الْمُؤْمِنِ الْعَالِمِ عَلَى الْمُؤْمِنِ الْعَابِدِ سَبْعُونَ دَرَجَةً	علم والے مومن کو عبادت گذار مومن پر ستر درجہ فضیلت حاصل ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے، عالم اور عابد میں ستر درجہ کا فرق ہے، اور دو درجہ کے درمیان کی مسافت ستر سال گھوڑے کی دوڑ کی مسافت کے برابر ہے۔

ایک حدیث میں ہے، تھوڑا سا عمل جو علم پر مبنی ہے، بہت ہے، اور بہت سا عمل جس کی بنیاد ناعلمی اور جہل پر ہے وہ بے فائدہ ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ علم مال سے بہتر ہے، اس لئے علم تیرا نگہبان ہے، اور مال کی تو نگرانی کرتا ہے، علم حاکم ہے اور مال محکوم، مال خرچ کرنے سے کم ہو جاتا ہے، اور علم بڑھتا ہے۔

علم کی فضیلت میں بزرگوں کے بہت سے اقوال ہیں، مثلاً فتح موصلی نے ایک بار فرمایا کہ اگر بیمار کو کھانا پینا، دوا دارو نہ دی جائے تو وہ مرے گا یا نہیں، لوگوں نے کہا کہ مر جائے گا، اسی طرح اگر دل کو تین روز علم و حکمت کی غذا نہ دی جائے تو مر جائے گا، اور یہ قول سچ ہے کہ علم و حکمت دل کی غذا ہے، اور اس سے ہی زندہ رہتا ہے، جیسے غذا بدن کے لئے ضروری ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ میرے نزدیک تھوڑی دیر رات کے علمی مذاکرات تمام رات کی عبادت سے بہتر ہیں، اسی طرح کا قول حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت احمدؒ بن حنبل کا بھی ہے۔

"زبیر ابوبکر نے کہا ہے کہ میرے والد نے عراق میں مجھے خط لکھا کہ تحصیل علم میں مشغول ہو جاؤ، اس لئے کہ درویشی کی حالت میں علم مال ہے، اور تونگری میں جمال حضرت لقمانؑ نے اپنے بیٹے کو نصیحت کی کہ علما کی صحبت میں بیٹھا کرو، اللہ تعالیٰ دلوں کو حکمت کے نور سے ایسا ہی زندہ کرتا ہے، جس طرح بارش سے زمین، بعض حکما نے کہا ہے کہ جب عالم کا انتقال ہو جاتا ہے تو چڑیا فضا میں، اور مچھلیاں پانی میں اس کے لئے روتی ہیں، اگرچہ اس کا چہرہ ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے لیکن اس کا ذکر دلوں سے ختم نہیں ہوتا"

غرض اسلام میں علم کی اتنی فضیلت ہے کہ اس کے برابر کسی اور عبادت کا درجہ نہیں، اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو جب پیدا کیا تو انھیں ساری اشیاء کا علم دیا، پھر مسابقے کی ایک محفل قائم کی، قرآن عزیز میں ہے، اور اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کر کے سب چیزوں کے اسما کا علم دیا، پھر وہ چیزیں فرشتوں کے روبرو کر دیں، پھر فرمایا کہ بتلاؤ مجھکو ان چیزوں کے اسما مع ان کے آثار

وخواص کے ، اگر تم سچے ہو ، فرشتوں نے عرض کیا آپ تو پاک ہیں ہم کو تو علم نہیں بجز اس کے جو آپ نے دیا ہے ، بیشک آپ بڑے علم والے حکمت والے ہیں (کہ جس کے لئے جس قدر مصلحت جانا اسی قدر فہم و علم عطا فرمایا) ، حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اے آدم ! ان کو چیزوں کے اسما بتلادو ، پس جب انھوں نے ان کو بتلادئے تو حق تعالیٰ نے فرمایا دیکھو میں تم سے کہتا نہ تھا ، کہ بیشک میں جانتا ہوں تمام پوشیدہ چیزوں آسمانوں اور زمین کی اور جانتا ہوں جس بات کو تم ظاہر کرتے ہو اور جس بات کو دل میں رکھتے ہو ، اور جس وقت حکم دیا ہم نے فرشتوں کو کہ سجدے میں گر جاؤ آدم کے سامنے ، سو سب سجدے میں گر پڑے بجز ابلیس کے ، اس نے کہنا نہ مانا اور غرور میں آگیا ، اور ہو گیا کافروں میں سے ۔

اس سلسلے میں دو امر قابل ذکر ہیں ، اول تو یہ کہ علم کا مرتبہ عبادت سے بڑھ کر ہے آدم علم کی علامت تھے ، اس کے مقابلے میں فرشتے اور جن تھے ، جو کثرت عبادت میں ضرب المثل تھے ، مگر اس کے باوجود انھیں آدم کے سامنے سجدے کا حکم دیا گیا ، اور ابلیس کے انکار پر اسے راندۂ درگاہ کر دیا گیا ۔

دوسری بات یہ ہے کہ حضرت آدمؑ کا علم اشیا کا علم تھا ، کائنات میں جتنی چیزیں تھیں سب کے نام مع ان کے خواص کے حضرت آدمؑ کو سکھا دئے گئے تھے ، اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اشیائے کائنات کا علم ایک لحاظ سے علم نبوت میں داخل ہے ،

علم کی اتنی اہمیت کے پیش نظر مسلمان ابتدائے اسلام ہی سے اسکی طرف بڑے انہماک سے متوجہ ہوئے ، ہر مسجد ایک مدرسہ یا تعلیمی درسگاہ ہو گئی ، اور دیکھتے دیکھتے لاکھوں کی تعداد میں چھوٹے بڑے مدرسے وجود میں آگئے ، گھر گھر علم کا چرچا پھیل گیا ، ہر شخص نے اپنے وسائل کے اعتبار سے تحصیل علم کی ، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی صدی میں سارے اسلامی معاشرے میں علمی برتری کے واضح خطوط نظر آنے لگے ، علم عام ہوا ، اور اتنا عام ہوا کہ علم کی عمومیت کی ایسی مثال اس دور کے

کسی اور معاشرے میں نہیں ملتی ، اس کے متعدد مثبت نتائج پیدا ہوئے ، مثلاً

۱۔ بڑے بڑے مدرسے قائم ہوئے (۲) کتابخانوں کی تشکیل ہوئی (۳) غیر علمی مطالعات بھی علوم کے زمرے میں شامل ہوئے (۴) لاکھوں کتابیں لکھی گئیں ، خطاطی کا فن وجود میں آیا اور ہزاروں نامور خطاط پیدا ہوئے (۵) ایسے علما و فضلا کثرت سے نمودار ہوئے جن کے کارنامے رہتی دنیا تک احترام کی نظر سے دیکھے جائیں گے ۔

ویسے اسلامی معاشرے میں ہر مسجد مدرسہ ہے ، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ مسجد مسلمانوں کی دنیوی و دینی زندگی کا مرکز تھا ، یہیں نماز ادا کی جاتی ، یہیں تعلیم و تعلم کا عمل انجام پذیر ہوتا ، یہیں نکاح و طلاق ہوتے یہیں چھوٹے بڑے مقدمے فیصل ہوتے ، یہیں وفود جاتے ، یہیں سفرا آتے ، یہ سب اس وجہ کر تھا کہ اسلام میں دین و دنیا کا امتیاز بے معنی ہے ، یہاں دنیا بھی دین ہے ، اور دین ساری چیزوں پہ محیط ہے ۔ دنیا کا دین سے الگ تصور گمراہی ہے ، اقبال نے سچ کہا ہے ؎ جدا دین سے سیاست ہو تو رہ جاتی ہے چنگیزی لیکن یہ باتیں صرف ابتدائی دور کی ہیں ، جب معاشرے میں ترقی کے آثار نمایاں ہوئے تو ہر ایک امر کے لئے الگ الگ ادارے کی ضرورت محسوس ہونے لگی ، اسی کے تحت علمی ضرورت کے لئے بڑے بڑے مدرسے قائم ہونے شروع ہوئے ، لیکن واضح ہے کہ یہ عمل کئی صدی بعد شروع ہوا ۔ اور اس کا نقطۂ عروج مدارس نظامیہ کا قیام ہے ۔ ان کے قیام میں نظام الملک طوسی وزیر متوفی ۴۸۵ھ کا بڑا دخل ہے ، بلکہ ابن خلکان کا قول ہے کہ اسے مدارس اسلامیہ کا بانی سمجھنا چاہئے ، سبکی نے طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۱۳۷ میں لکھا ہے ۔

" نظام الملک نے بلخ ، نیشاپور ، ہرات ، اصفہان ، بصرہ ، مرو ، آمل ، موصل میں مدرسوں کی بنیاد ڈالی ، ہمارے استاذ ذہبی نے نظام الدین کو اسلامی مدرسوں کا

بانی قرار دیا ہے، مگر واقعہ ایسا نہیں ہے، نیشاپور میں نظام الملک کی پیدائش سے قبل مدرسہ بیہقیہ موجود تھا، اسی شہر میں ایک اور مدرسہ سعدیہ نام کا تھا، اسکی بنیاد سلطان محمود کے بھائی امیر نصر بن سبکتگین نے ڈالی تھی، نیشاپور ہی میں ایک تیسرا مدرسہ تھا جس کا بانی ابوسعید اسماعیل بن علی المثنی استرآبادی تھا، چوتھا مدرسہ استاد ابواسحاق اسفرائینی کا بنوایا ہوا تھا، اور ابواسحاق کے حال میں لکھا ہے کہ اس کے پہلے اس درجے کا کوئی مدرسہ نہ تھا، اس سے واضح ہے کہ اسفرائینی سے قبل اس شہر میں مدرسے موجود تھے، البتہ نظام الملک پہلا شخص ہے جس نے مدرسے کے طالب علموں کے لئے راتبہ مقرر کیا تھا۔"

مدرسہ بیہقیہ کے بانی امام ابوالحسن محمد بن شعیب البیہقی شافعی (فقیہ متوفی ۳۰۴ھ) اور سعد بن مسعود عتبی نیشاپوری بھی اس مدرسے میں رہ چکے تھے، امام ابوالحسن علی بن حسین بیہقی کچھ دنوں اسی مدرسے میں درس دے چکے تھے، اسی مدرسے میں امام الحرمین ابوالمعالی عبدالملک ابن عبداللہ جوینی (م ۴۷۸) استاد امام غزالی، ابوالقاسم اسکاف اسفرائینی سے اصول سیکھتے تھے۔

نظام الملک نے نیشاپور میں ایک مدرسہ امام الحرمین ابوالمعالی عبدالملک بن عبداللہ جوینی (م ۴۷۸) کے لیے کھولا تھا، اس میں امام الحرمین نے تیس (۳۰) سال درس دیے، درس و تدریس کے علاوہ وعظ و خطابہ و مجلس ذکر بھی ان ہی کے ذمے تھی، کہتے ہیں کہ روزانہ تین سو (۳۰۰) آدمی ان کے درس میں شامل ہوتے، اور شامل ہونے والوں میں ائمہ، علما اور وزیروں اور صدروں کے بیٹے بھی تھے، امام محمد غزالی (م ۵۰۵) اس مدرسہ کے فارغ التحصیل تھے، فارسی کا مشہور شاعر انوری ابیوردی (م ۵۸۳) نے جوانی میں اسی مدرسے میں علوم کی تحصیل کی تھی۔

نظامیہ بغداد کی بنیاد ۴۵۹ھ میں پڑی، اس مدرسے نے اسلامی علوم کی جیسی خدمت کی ہے، کم مدرسوں کے ذریعے ایسا شاندار کام انجام پذیر ہوا ہوگا، ابن جبیر اندلسی ۵۸۰ھ میں بغداد آیا تھا، اس نے اس مدرسے کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے، ۷۲۷ھ میں ابن بطوطہ یہاں آیا، اور اس نے اس کی تعریف کی، غرض تمام ممالک اسلامیہ میں مدرسۂ نظامیہ نے بے مثال علمی خدمات انجام دیں، نظامیہ بلخ میں رشید الدین وطواط (م ۵۷۳ھ) نے آدم بن اسد الہروی سے جو اس زمانے کے مشہور محدث و ادیب تھے، علوم کی تحصیل کی تھی، اصفہان کے مدرسہ سے جو صدر الدین خجندی (م ۴۸۳) کے نام پر صدریہ کہلاتا تھا، پانچویں اور چھٹی صدی کے سینکڑوں علما و فضلا نکلے ہیں، مرو کے مدرسۂ نظامیہ کا ذکر ابوالحسن بیہقی نے اپنی کتاب جوامع احکام النجوم میں کیا ہے، ہرات کا مدرسۂ نظامیہ نویں صدی ہجری تک قائم تھا، فارسی کے مشہور شاعر و ادیب مولانا عبدالرحمٰن جامی اسی مدرسے کے فارغ التحصیل تھے۔

مدارس نظامیہ کی تقلید میں سارے ایران اور ماوراءالنہر کے علاقے میں متعدد مدارس کھلے، ان میں ملک شاہ سلجوقی (م ۴۸۵) کا مدرسہ محلۂ کران اصفہان قابل ذکر ہے، جو شافعیہ اور حنفیہ دونوں کے لیے وقف تھا، نیشاپور میں مدرسۂ خاتون مہد عراق کی بنیاد پڑی، اس میں ایک بڑا کتب خانہ تھا، اس میں ابوالفضل بیہقی کی تاریخ کے چند مجلد تھے، واضح رہے کہ اب اس تاریخ کے کچھ ہی مجلد باقی ہیں، جو تاریخ مسعودی کے نام سے ایک بار ہندوستان میں اور دو بار ایران سے شائع ہو چکی ہے، مرو شاہجہاں کا مدرسہ خصوصیت سے قابل ذکر ہے، اس میں سمعانی (م ۵۶۲ھ) نے کچھ دنوں درس دیا، شمس الائمہ ابوالقاسم اسماعیل بن حسن بیہقی (م ۵۱۲) بھی یہیں کے ایک مدرسے میں درس دیتے تھے۔ یاقوت حموی ساتویں صدی کے آغاز میں ایک مدرسے کا ذکر کرتا ہے، جو محمد بن منصور متوفی (م ۴۹۴) کا بنوایا تھا، ہمدان میں

جمال الدین ای آبہ نے ایک مدرسہ تعمیر کرایا تھا، جس کے لیے محمد راوندی مولف راحۃ الصدور کے خالو ابوالفضل احمد بن علی راوندی کو طلب کیا گیا تھا، عماد الدین کاتب نے اپنی کتاب نُبدۃ النصرہ میں لکھا ہے کہ ہمیں کے ایک مدرسے میں جو جمال الدین خادم جاندار کا بنوایا ہوا تھا، سلطان مسعود ابن محمد بن ملک شاہ (م۔ ۵۴۶) دفن ہوا۔ اس مدرسے کا ذکر رشید الدین فضل اللہ نے بھی جامع التواریخ میں کیا ہے۔

نوشیروان خالد وزیر عباسیان (م۔ ۵۳۲) جس کے نام پر حریری نے مقامات لکھے ہیں۔ اس نے کاشان میں ایک بڑا مدرسہ تعمیر کرایا، اس میں بہت سی کتابیں وقف کیں، ۶۴۴ میں وہ مدرسہ اور کتاب خانہ دونوں باقی تھے لیکن ۴۲۲ میں تجارب السلف کے مولف کے بقول وہ برباد ہو چکے۔ ابوجعفر علاء الدولہ کالیجار نے ۵۲۰ میں یزد میں ایک عالی شان مدرسہ قائم کیا، وہ اسی میں مدفون ہے۔ نظامیہ بغداد کے بعد متعدد اہم مراکز بغداد میں قائم ہوئے جن میں نظامیہ خصوصیت سے قابل ذکر ہے، اس میں ایک بڑا کتاب خانہ تھا جس کی فہرست ۳۶۰ جلدوں میں تھی، اس میں پچاس حصے اور چار ہزار کاونٹر تھے، آخر میں مدرسۂ نظامیہ کے جواب میں ۶۲۵ھ میں مدرسہ منتصریہ کی بنیاد المستنصر باللہ (۶۲۳ - ۶۴۰ھ) کے حکم سے پڑی، دو سال تک اس پر کام ہوتا رہا، اس کے ساتھ ایک بڑا کتب خانہ تھا، ڈیڑھ ہزار حمال اس کی کتابوں کے منتقل کرنے پر مامور تھے، ضیاء الدین احمد خازن کتاب خانۂ خلیفہ اور ان کے والد شیخ عبدالعزیز نے فنی اعتبار سے کتابوں کی فہرست تیار کی، اس سے کتابوں کا حصول آسان ہو گیا۔

اسلامی تمدن میں مدرسے اور کتاب خانے کی اہمیت اس وجہ سے ہوئی کہ اس تمدن میں علم کو سب پر بالادستی حاصل تھی، اسی کے نتیجے میں ہزاروں اور لاکھوں مدرسے اسلامی ممالک میں وجود میں آئے، اسی کے ساتھ کتاب خانوں کی بھی تشکیل ہوئی، بادشاہوں سے لیکر عام آدمیوں تک

کو کتاب اور کتاب خانوں سے دلچسپی تھی، چنانچہ بغداد، رے، بخارا، سمرقند وغیرہ میں بادشاہوں اور امیروں کی طرف سے شاہی کتاب خانے وجود میں آئے، مغرب میں اندلس میں خلفائے اموی نے کتاب خانے جمع کئے، مصر میں فاطمی خلفا بھی کتاب خانوں کے جمع کرنے میں بہت پیش پیش تھے، کہتے ہیں اندلس کے فرماں روا الحکم (م۔ ۳۶۶) کا کتاب خانہ اتنا عظیم تھا کہ اس کی فہرست ۴۴ جز میں تھی اور ہر جزء ۴۴ صفحے پر مشتمل تھا اس میں ۴ لاکھ کتابیں بتائی جاتی ہیں اسی طرح فاطمی خلفا کے زمانے میں قاہرہ میں جو کتب خانہ تھا اس میں سولہ (۱۶) لاکھ مخطوطات تھے، اس میں محض علوم سے متعلق ۱۸ ہزار مخطوطے تھے، بغداد میں ہارون کے زمانہ میں بیت الحکمۃ کا کتاب خانہ سب سے اہم کتاب خانہ بن گیا تھا، ابن ندیم مولف الفہرست (م۔ ۳۸۵) نے اس کتاب خانہ کی توصیف کی ہے، یہ مرکز غلبۂ تاتار ۶۵۶ تک پورے شباب پر تھا، عضد الدولہ دیلمی کا کتاب خانہ شیراز میں نہایت معروف تھا، مقدسی نے اس کو دیکھا تھا، اور اس کی تعریف کی ہے، آل بویہ کے وزیر ابوالفضل بن عمید کا کتب خانہ انواع و اقسام کی کتابوں سے مملو تھا، مشہور مورخ و ادیب ابو علی بن مسکویہ ان کا خازن تھا۔ ابن عمید کا شاگرد اور جانشین صاحب کافی اسماعیل بن عباد (م ۳۸۴) تھا، اس نے ایک عالی شان کتاب خانہ جمع کیا تھا، نوح بن منصور سامانی نے اس کو وزارت کا عہدہ سپرد کرنا چاہا تو اس نے اس بنا پر عذر کیا کہ وہ اپنا سامان منتقل نہیں کر سکتا خصوصاً کتب خانہ جو چار سو اونٹوں سے زیادہ کے بوجھ کی کتابوں کو حاوی تھا۔

ابونصر شاہ پور بن اردشیر وزیر صمصام الدولہ و بہاء الدولہ دیلمی نے بغداد میں دار العلم کی بنیاد ڈالی، اس کے ساتھ ایک عظیم کتاب خانہ تھا، جو سلاجقہ کے غلبہ تک دائر تھا، عضد الدولہ دیلمی کے ایک امیر نے رامہرمز میں ایک کتاب خانہ اور دوسرا البصرہ میں قائم کیا، رامہرمز کا کتابخانہ معتزلی مذہب کے لئے خصوصیت سے وقف تھا، بخارا میں سامانی سلاطین نے بڑے بڑے

کتاب خانے قائم کئے، جو علم کے مرکز بھی تھے، طبقات الاطبا میں ابن سینا کے ذیل میں لکھا ہے کہ حکیم موصوف کے بقول بخارا کے کتاب خانے میں بہت سے کمرے تھے، ہر ایک میں کتابوں کے صندوق تھے، ہر نوع کی کتاب کے لئے الگ الگ کمرے تھے، اس میں ایسی ایسی کتابیں نظر میں آئیں کہ اکثر علما نے نام بھی نہ سنا ہو گا۔ اس کتب خانہ میں جس سے ابن سینا نے استفادہ کیا تھا، کچھ دنوں بعد آگ لگ گئی۔ یاقوت حموی جو حملۂ تاتار سے قبل خراسان اور ماوراء النہر میں رہ چکا تھا، لکھتا ہے کہ مرو میں ۱۲ کتاب خانے تھے، ہر ایک میں تقریباً بارہ ۱۲ ہزار مجلدات تھیں، یاقوت کا گھر بھی کتابوں سے خالی نہیں رہا۔

علمی مراکز، کتاب خانے، مدرسے وغیرہ کی تعمیر و تشکیل میں بادشاہ، وزیر، امیر، علماء و فضلا سب کی کوشش کو دخل رہا ہے، اسلامی تمدن کی یہ خصوصیت نہایت درجہ قابل دید ہے کہ علماء و فضلا قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے، ان میں اکثر وزارت کے عہدۂ جلیلہ پر فائز بھی ہوئے جیسے ابن عمید، صاحب ابن عباد، مہلبی، شاپور بن اردشیر، ابن سعدان، ابو علی سینا، جیہانی، بلعمی، ابو الحسن سہیلی، نظام الملک طوسی وغیرہ، اسی قدر دانی کا نتیجہ علمی برتری کی شکل میں رونما ہوا، اور یہی علمی بالادستی اس معاشرے کی سب سے ممتاز خصوصیت ہے، اسی کی وجہ سے علمی ترقی ہوئی، اور اسی بنا پر علمی مراکز، مدرسے، کتاب خانے قائم ہوئے، اتنے کہ دوسرے معاشرے میں ان کا ذکر مذکور نہیں۔

مسلمانوں کے غلبے کے دور میں نہ صرف علوم میں ترقی ہوئی، بلکہ نئے نئے علوم ایجاد ہوئے، قرآن آسمانی صحیفہ ہے، اس کے مطالعے سے عوام اور خواص دونوں کو یکساں دلچسپی رہی ہے، اس مطالعے نے ایسی شکلیں اختیار کیں کہ ان سے کئی علوم ایجاد ہوئے، ان میں ممتاز ترین علم تجوید و قرأت اور علم تفسیر ہے، اور آخر الذکر تو ایسا جامع ہے کہ اس میں کئی اور علوم شامل ہیں۔

علم قرأۃ ان تمام اختلافات سے بحث کرتا ہے، جن کا تعلق قرآن کے الفاظ سے اور بعض حروف کی کیفیات اور ادائگی سے ہے، اور اس کے پیچھے وہ جذبہ کارفرما ہے کہ کلام اللہ شریف کو تحریفات

و تغیرات سے محفوظ رکھا جائے، رفتہ رفتہ اس کے اصول و ضوابط مقرر ہوئے، اور وہ ایک مخصوص علم ہو گیا، جو مسلمانوں سے مخصوص ہے، ابتدا میں حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ، حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، اس کے بعد قراء سبع کا نام آتا ہے، اور پھر تین اور قراء جنھوں نے اس فن میں بڑی ناموری حاصل کی۔

ان دس قراء کے نام حسب ذیل ہیں۔

نافع بن عبد الرحمٰن بن ابی نعیم (م ۱۶۹) عبد اللہ بن کثیر (م ۱۲۰) ابو عمرو بن العلا (م ۱۵۴) عبد اللہ بن عامر (م ۱۱۸) عاصم بن ابی النجود (م ۱۲۹) حمزہ بن حبیب (م ۱۵۴) ابو الحسن علی بن حمزہ (م ۱۸۹) ابو محمد یعقوب بن اسحاق الحضرمی (م ۲۰۵) ابو جعفر مخزومی (م ۱۳۲ھ) ابو محمد خلف بن ہشام البزاز (م ۲۲۹)

کسی مذہبی صحیفے کے پڑھنے کے واسطے سے ایک اہم علم وجود میں آجانا، ایسی نادر و عجوبہ بات ہے جس کی مثال تاریخ بشر میں کہیں نہیں ملتی۔

مطالعات قرآن سے متعلق دوسرا علم تفسیر ہے، یہ علم وہ ہے جس میں قرآن کے معانی کے حقائق نحو، صرف، لغت، تاریخ، تہذیب وغیرہ کی روشنی میں واضح کئے جائیں، اس طرح کے مطالعے کا مقصد منشائے الٰہی کی جستجو ہے، اس کے مخصوصات موضوعات اسباب نزول و ترتیب نزول توضیح اشارات و مجملات، تمیز میان ناسخ و منسوخ، محکم و متشابہ، تفصیل قصص و حکایات وغیرہ ہیں۔

ابتدا میں صحابہ قرآن کے مطالب کی تفسیر و توضیح کرتے رہے، لیکن یہ روایت کتنی سے زیادہ شفاہی رہی، ان ابتدائی مفسرین میں خلفائے اربعہ کے علاوہ حضرت ابن مسعودؓ، ابی بن کعبؓ، زید بن ثابتؓ، عبد اللہ بن زبیرؓ، انس بن مالکؓ، ابو ہریرہؓ، جابر بن عبد اللہؓ، عمرو بن عاصؓ،

ابوموسیٰ اشعریؓ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، بعد میں ہزاروں مفسرین پیدا ہوئے، اور سیکڑوں ہزاروں تفسیریں لکھی گئیں، یہاں تک کہ تیسری صدی میں محمد بن جریر طبری عالم وجود میں آئے جنکی تفسیر "جامع البیان فی تفسیر القرآن" جو اصلاً ۴۰ مجلدات پر مشتمل تھی، تیس جلدوں میں شائع ہوئی، اسی کا فارسی ترجمہ یا تلخیص سامانی امیر منصور بن نوح (۳۵۱ - ۳۶۵) کے مشورہ سے، ۷ جلدوں میں ہوا۔[1]

مسلمانوں کی اپنے آقا سے غیر معمولی محبت کے نتیجے میں ایک حیرت انگیز علم وجود میں آیا جس کو علم حدیث کہتے ہیں، اس علم کے واسطے سے پیغمبر علیہ السلام کے اقوال و افعال کی تحقیق و تدقیق ہوتی ہے، اس کے دو بڑی قسمیں ہیں، علم روایۃ الحدیث، اور علم درایۃ الحدیث، اس علم کے مختلف شعبے ہیں، اور ہر ایک بمنزلہ ایک علم کے ہے، جیسے علم شرح الحدیث، علم اسباب ورود الاحادیث۔ علم تاویل اقوال النبی، علم غرائب لغات الحدیث، علم تلفیق الاحادیث، علم رواۃ الاحادیث، علم التطرفی الاسانید وغیرہ۔

محدثین نے حضور سرور کائناتؐ کے اقوال کے جمع کرنے، ضعیف اور قوی کے درمیان حد فاصل کھینچنے اور انھیں رطب و یابس سے پاک کرنے میں جو محیر العقول کارنامے انجام دیے دنیا کی تاریخ اس کی مثال سے خالی ہے، ایک ایک محدث کو احادیث کے فراہم کرنے میں ہزاروں میل کا سفر کرنا پڑا، پھر لاکھوں احادیث میں سے اعلیٰ معیار پر جانچنے کے بعد ایک مجموعہ تیار ہوا، اور ہر حدیث کے درج کرنے میں اسناد پر انتہائی غور و فکر کے علاوہ تقویٰ کو عمل میں لایا گیا، امام بخاری نے ایک ہزار مشائخ سے مل کر تقریباً چھ لاکھ حدیثیں ۱۶ برس کی مدت میں ایران، عراق، شام، عرب، مصر کی ہزاروں میل کی مسافت طے کرنے کے بعد فراہم کیں، ان میں صحیح بخاری تقریباً سات ہزار دو سو پچھتر

[1] دانشگاہ تہران سے ۱۳۳۹ تا ۱۳۴۴ شمسی حبیب یغمائی کی تصحیح سے، ۷ جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔

احادیث پر مشتمل ہے، . . . . . . امام بخاری ہر حدیث کے ضبط تحریر میں لانے سے قبل وضو کرتے اور دو رکعت نماز ادا کرتے،

علم حدیث کے ضمن میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اقوال کی پرکھ کے جو معیار اسوقت قائم کیے گئے اور جن پر ہزاروں لاکھوں اقوال پورے اترے، ویسے معیار کہیں سننے میں نہیں آتے انھوں نے روایت و درایت کے جو اصول بنائے، اس میں اہم عنصر شہادت کی اہمیت کے باوجود شاہد یا راوی کے اوصاف کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے، اس کا واضح نتیجہ یہ ہے کہ تاریخ بشر میں کوئی واقعہ اتنی شہادتوں اور روایتوں سے نقل نہیں ہوا ہے، جتنی ایک جعلی حدیث کے سلسلہ کی شہادتیں ہیں، تہذیب عالم میں اقوال کے جانچنے اور پرکھنے کی اتنی بڑی کوشش کا پتا نہیں چلتا، مسلمانوں میں اس سلسلے میں جو بلند اصول مرتب ہوئے، اور جن پر ہزارہا اقوال جانچ لیے گئے، ان اصول پر دوسرے تمدن کے اقوال کا ذکر تو کیا، ان کی ممتاز ترین شخصیات پوری نہیں اترتیں، اگر ان اصول و نتائج کی روشنی میں فیصلے صادر کیے جائیں تو اشخاص کے وجود مشکوک ہو جائیں گے اور معاملہ ظن و تخمین سے آگے نہیں بڑھے گا، غرض ایک طرف تو شک و شبہ کی گہری گرد تہذیب بشر کے ہزارہا افراد و اقوال پر چڑھی ہوئی ہو اور دوسری طرف اسلامی معاشرے کے ہزارہا کردار اپنی تاریخیت کی وجہ سے گویا جانے پہچانے فرد معلوم ہوتے ہیں، غالباً اسی تصور کے پیش نظر علامہ اقبال نے کہا تھا۔

گماں آباد ہستی میں یقیں مرد مسلماں کا
بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی

مسلمانوں نے علم حدیث پر جتنی توجہ کی اتنی کسی اور علم پر نہیں کی، اور اس کا حق بھی تھا، اس علم میں جتنی محنت، صلاحیت، اخلاص وغیرہ درکار تھا، اتنا کسی علم میں نہ تھا، محدثین کی کوشش بہرحال اس امر پر تھی کہ کوئی غلط یا مشکوک بات حضورؐ کی طرف منسوب نہ ہو جائے، بہرحال یہ حیرت انگیز کام انجام پایا، اور اس سے منجملہ اور فوائد کے دو تین بڑے فائدے ہوئے اول

یہ کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگی اور سیرت و شخصیت کے ایک ایک خدوخال نمایاں ہو گئے، جن کی بنیاد معتبر ترین ماخذ پر تھی۔

دوم یہ کہ حضورؐ کی سیرت کے ایک ایک خدوخال کے روشن ہو جانے کے بعد کائنات عالم کی کوئی شخصیت آپ کے پاسنگ نہیں ہوتی، کوئی شخص اپنے والد کے بارے میں اتنے وثوق سے کوئی بات نہیں کہہ سکتا جتنا حضورؐ کے متعلق کہہ سکتا ہے، حضورؐ کی زندگی کی یہی تاریخیت غیروں سے بھی اپنا لوہا منوا رہی ہے، یہ صدقہ ہے ہزاروں محدثین کی مخلصانہ اور جان توڑ محنت کا جو احادیث کی جمع آوری میں انگر ناپڑی ہیں، مجھے وہ دن دور نظر نہیں آتا جب ہزاروں لاکھوں انسان جوق در جوق حضورؐ کی سیرت سے متاثر ہو کر آپ کی غلامی کا دم بھرنے لگیں گے۔

تیسرا فائدہ یہ ہوا کہ اسی کے طفیل میں آج سے سیکڑوں سال پہلے کے ہزاروں افراد کے حالات نہایت مستند ذرائع سے سامنے آگئے ہیں، دنیا کی تاریخ پر یہ محدثین کا بڑا احسان ہے، اس کے بارے تاریخ بشر کی گردن سبکدوش نہیں ہو سکتی۔

اس میں شبہ نہیں کہ قرن اول و دوم میں احادیث کے مختلف مجموعے ممتاز محدثین نے جمع کئے، ان محدثین میں ابن جریج (م۔ ۱۵۰) مکہ میں، محمد بن اسحاق (م۔ ۱۵۱) اور مالک بن انس (م۔ ۱۷۹) مدینہ میں، ربیع بن صبیح (م۔ ۱۶۰) سعید بن عروبہ (م۔ ۱۵۶) حماد بن سلمہ (م۔ ۱۷۶) بصرے میں، سفیان ثوری (م۔ ۱۶۱) کوفے میں، ابن المبارک (م۔ ۱۸۱) نے خراسان میں احادیث کی فراہمی کی کوششیں کیں، لیکن ان مجموعوں میں سے سوائے موطا ابن مالک کے کوئی موجود نہیں، تیسری صدی میں احادیث کے سلسلے میں نقد و انتقاد کے طریقے وضع ہوئے، اور احادیث کے درمیان تمیز کرنے کے اصول منضبط ہوئے، رجال حدیث کے بارے میں اطلاعات فراہم ہوئیں، اسی کا نتیجہ صحاح ستہ کا وجود ہے، جو حسب ذیل مجموعوں سے عبارت ہیں۔

صحیح بخاری جامع امام محمد بن اسماعیل بخاری (م۔ ۲۵۶) صحیح مسلم ابو الحسن مسلم بن الحجاج نیشاپوری (م ۲۶۱) سنن ابن ماجہ ابو عبداللہ محمد بن یزید قزوینی (م۔ ۲۷۳) سنن ابو داؤد بصری (م۔ ۲۷۵) جامع ترمذی، امام ترمذی (م۔ ۲۷۹) سنن نسائی، ابو عبدالرحمٰن النسائی (م۔ ۳۰۳) اس کے ساتھ امام احمدؒ بن حنبل کی کتاب مسند بھی حد درجہ قابل توجہ ہے،

علم فقہ بھی مسلمانوں کی ایجاد ہے، یہ ایسا علم ہے، جو شرع کے عملی احکام سے بحث کرتا ہے، اس علم کی بنیاد استنباط احکام پر ہے، جو کتاب و سنت سے اخذ کیے جاتے ہیں اس علم میں اجتہاد درجۂ اول کی حیثیت رکھتا ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ فقہ کے مختلف مکتب فکر ہو گئے، اور ان کے اختلاف نے سیاسی رنگ اختیار کر لیا، جس سے مسلمانوں میں زبردست اختلافات رونما ہوئے اس سے اسلام کو بہت نقصان پہنچا، سنیوں میں فقہ کے حسب ذیل چار مکاتب فکر ہیں۔

۱۔ حنفی جو حضرت ابو حنیفہؒ (م۔ ۱۵۰) کے پیرو ہیں (۲) مالکی جو حضرت مالکؒ بن انس (م۔ ۱۷۹) کی پیروی کرتے ہیں (۳) شافعی جو حضرت محمد بن ادریس شافعیؒ (م۔ ۲۰۴) کے ماننے والے ہیں (۴) حنبلی جو امام احمدؒ بن محمد حنبل (م۔ ۲۴۱) کے تتبع کرنے والے ہیں، ان چار بڑے مکاتب کے علاوہ فقہ جعفریؒ پر حضرات شیعہ عمل کرتے ہیں، سنیوں میں بھی سفیان بن سعید ثوری (م۔ ۱۶۱) محمد بن جریر طبری (م۔ ۳۱۰) نے ائمہ اربعہ سے کسی حد تک مختلف مکاتب فکر کی بنیاد ڈالی، اور ان کے بھی ماننے والے ہو گئے تھے۔

ہندوستان میں خصوصیت سے فقہ میں بہت جزئی اختلافات پیدا ہوئے جن کا نتیجہ اس لحاظ سے بہت برا ہوا، کہ اس سے مسلمانوں کی اجتماعی قوت کو زبردست دھکا لگا، لیکن قابل توجہ یہ بات ہے کہ علم فقہ پر جتنی چھوٹی بڑی کتابیں ملتی ہیں، کسی دوسرے فن میں نہیں ملیں گی اور عام مسلمانوں کو اس علم سے جتنی دلچسپی رہی ہے، کسی علم سے نہ ہوگی، فقہ پر کتابوں کی تعداد

کروڑوں تک پہنچ جائے گی، اس سے اسلامی سرمایے میں بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دوسرے مذاہب میں مذہبی امور کو عملی شکل دینے کے کچھ مروجہ طریقے ہیں، اور اس مذہب کے ماننے والے اس طریقے پر عمل پیرا ہوتے ہیں، لیکن مروجہ طریقوں کو علمی درجہ نہیں مل سکتا، اور اسلام میں فقہ نے جیسی علمی شکل اختیار کی، اور اصول و فروع کے لحاظ سے جو مکاتبِ فکر پیدا ہوئے، اس کی مثال تہذیب عالم میں نہیں ملے گی، اور فقہ پر جو لٹریچر ہے اس سے سینکڑوں کتاب خانے پُر ہو سکتے ہیں۔

علم کلام وہ علم ہے، جس میں عقائد ایمانی پر عقلی دلائل قائم کئے جاتے ہیں، اس علم کے موضوع مباحث مبدا و معاد، توحید، تنزیہ و تجسیم وحدود ایمان و جبر و اختیار، و خلق، گویا عقائد کی تحقیق و تدقیق عقلی دلائل سے علم کلام کا اصل موضوع رہا ہے، اسکے نتیجے میں مسلمانوں میں کئی فرقے ہوئے جن میں اشاعرہ، معتزلہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں،

علم کلام پر اتنا مواد موجود ہے کہ وہ کئی ضخیم کتابوں کے لیے کافی ہے، یہ علم بھی خاص مسلمانوں کے درمیان پھیلا، کسی دوسرے مذہب میں اس کا نام نشان نہیں۔

تصوف کو ایران میں بڑی قوت ملی، اور تیسری صدی ہجری سے اس نے علمی شکل اختیار کی، اور ہزاروں صوفی پیدا ہوئے، انکی وجہ سے اسلامی زندگی میں تصوف کا بہت گہرا اثر ہوا، اس کے متعدد سلاسل ہیں، ہندوستان میں سلاسل چہار گانہ خصوصیت سے مقبول ہوئے، قادریہ، چشتیہ، سہروردیہ، نقشبندیہ، اسی سے سلسلہ فردوسیہ پیدا ہوا، غرض تصوف ایسا علم ہے، جو خالص اسلامی ہے، اور اس میں اتنی وسعت ہے کہ سیکڑوں تنقیدی کتابیں اس موضوع پر لکھی جاسکتی ہیں، یورپ و امریکہ میں اب یہ موضوع بڑی دلچسپی کا ہو گیا ہے، تصوف کا لٹریچر بہت وافر ہے، خصوصیت سے فارسی کے نثری اور شعری ادب کا بہت بڑا حصہ تصوف سے تعلق رکھتا ہے۔

(باقی)

اقبال کی دو نظمیں قرآن کے آئینے میں

از

جناب محمد بدیع الزماں، صاحب ریٹائرڈ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ، پھلواری شریف، پٹنہ

اقبال کے سارے تخیلات "انسان" اور "انسانیت" کے محور پر ہی گردش کرتے ہیں، اسی لئے انھوں نے اپنے سارے کلام میں انسان کی فطری خوبیوں اور صلاحیتوں کو اجاگر کرنا اور کوشش پیہم کے ذریعے تسخیر کائنات میں اپنی خوبیوں اور صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر نیابت الٰہی کا فریضہ انجام دیا جانا ہی اپنی شاعری کا مطمح نظر رکھا، ایسے تو یہ باتیں اُن کے سارے کلام میں ملتی ہیں مگر دو خصوصی نظموں میں انھوں نے اپنے ان خیالات کو یکجا نظم کیا ہے۔

پہلی نظم "فرشتے آدم کو جنت سے رخصت کرتے ہیں" اور دوسری نظم اس کے تتمہ کے طور پر "بال جبریل" ہی میں اس کے بعد ہی "روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے" ہے، دونوں نظموں کا ماخذ و منبع قرآن مجید کی آیات ہیں جن کو کہیں کہیں تو انھوں نے ہو بہو نظم کیا ہے، اور کہیں کوئی شعر یا اس کا کوئی مصرعہ یا پورا بند اُن آیات پر مبنی ہے، پہلی نظم جو درج ذیل ہے، کل پانچ اشعار پر مشتمل ہے

عطا ہوئی ہے تجھے روز و شب کی بے تابی — خبر نہیں کہ تو خاکی ہے یا کہ سیمابی!

سنا ہے خاک سے تیری نمود ہے لیکن — تری سرشت میں ہے کوکبی و مہتابی!

جمال اپنا اگر خواب میں بھی تو دیکھے — ہزار ہوش سے خوشتر تری شکر خوابی!

گراں بہا ہے ترا گریۂ سحر گاہی — اسی سے ہے ترے نخل کہن کی شادابی!

تری نوا سے ہے بے پردہ زندگی کا ضمیر کہ تیرے ساز کی فطرت نے کی ہے مضرابی!

اس نظم میں اقبال نے انسان کی بے پناہ صلاحیتوں اور تخلیقِ کائنات اور تخلیقِ آدم دونوں کے اسرار و رموز کو پانچ ہی اشعار میں سمو کر دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے، اس نظم کا یہ شعر

جمال اپنا اگر خواب میں بھی تو دیکھے ہزار ہوش سے خوشتر تری شکر خوابی!

درج ذیل آیات کا ترجمان ہے:۔

ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا۔ (لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ) (سورۃ۔ والتین۔ ۹۵۔ رکوع ۱)

اُس (خدا) نے زمین اور آسمان کو برحق پیدا کیا ہے اور تمھاری صورت بنائی، اور بڑی عمدہ بنائی۔ (وَصَوَّرَكُمْ فَأَحْسَنَ صُوَرَكُمْ) (سورۃ التغابن ۶۴۔ رکوع ۱)

ان آیات میں "بہترین ساخت" اور "تمھاری صورت بنائی اور بڑی عمدہ بنائی" سے مراد انسان کی صرف جسمانی طاقتیں یا ظاہرہ شبیہ ہی نہیں بلکہ انسان کو ہوش و گوش کا شعور، فکر و فہم اور علم و عقل کی صلاحیتیں، سیرت اور قوتِ ارادی بھی مراد ہیں۔

دوسری نظم "روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے"۔ میں اقبال یہ باور کراتے ہیں کہ حضرت آدمؑ کا جنت سے اخراج ایک سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت تھا، چونکہ خدا کو انسان کو روئے زمین پر خلیفۃ الارض بنانا تھا، اس لئے اسے اس منصب کی عمدہ برآری کیلئے بے پناہ صلاحیتوں سے صرف آراستہ کرنا مقصود نہ تھا، بلکہ اُن صلاحیتوں کو تسخیرِ کائنات کے کام میں بھی لانا تھا، اس لئے کائنات میں لاکھوں چیزوں کی تخلیق کی گئی، اور اس طرح خدا نے روزِ ازل ہی انسان کا تعلق کائنات سے اور کائنات کا تعلق انسان سے قائم کر دیا، اور انہی دو نکتوں کی اقبال نے دو الگ الگ ان نظموں میں وضاحت کی ہے، اس دوسری نظم میں وہ یہ بتا رہے ہیں

کہ یہ کائنات تمھارا استقبال اس لئے کرتی ہے، چونکہ تم کو تھوڑے ہی دنوں کے لیے سہی مگر ایک خوش کن زندگی گذارنی ہے، جس کے لیے خدا نے اتنی ساری چیزوں کی تخلیق کی ہے، پوری نظم اس طرح ہے:۔

کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ! مشرق سے اُبھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ!
اس جلوۂ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ! ایامِ جدائی کے ستم دیکھ، جفا دیکھ!
بے تاب نہ ہو معرکۂ بیم و رجا دیکھ!

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں یہ گنبدِ افلاک، یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ یہ صحرا، یہ سمندر یہ ہوائیں تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ

سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے! دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے!
ناپید ترے بحرِ تخیل کے کنارے! پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے!
تعمیرِ خودی کر، اثرِ آہِ رسا دیکھ!

خورشیدِ جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں! جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں!
اے پیکرِ گل کوششِ پیہم کی جزا دیکھ!

نالندہ ترے عود کا ہر تار ازل سے! تو جنسِ محبت کا خریدار ازل سے!
تو پیرِ صنم خانۂ اسرار ازل سے! محنت کش و خونریز و کم آزار ازل سے!
ہے راکبِ تقدیرِ جہاں تیری رضا دیکھ!

اس نظم کے مختلف بندوں میں اقبال نے خدا کی پیدا کردہ نعمتوں کا ذکر کیا ہے جسے

انسان کے تصرف کے لئے پیدا کیا گیا ہے، اب یہ انسان کا کام ہے کہ وہ ان کی تسخیر میں لگ کر اپنے اعمال صالح اور کوشش پیہم سے ایک تازہ جہاں آباد کرے، اس نظم کے پہلے بند کے پہلے الفاظ "آنکھ کھول" بہت معنی خیز ہیں جو ہو بہو درج ذیل قرآنی آیات سے ماخوذ ہیں :-

"ان سے کہو، "زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے اُسے آنکھیں کھول کر دیکھو" اور جو لوگ ایمان لانا ہی نہیں چاہتے" ان کے لیے نشانیاں اور تنبیہیں کیا مفید ہو سکتی ہیں"۔
(سورۃ یونس ۱۰۔ رکوع ۱۰)

"کیا ان لوگوں نے کبھی دیکھا نہیں ہے کہ کس طرح اللہ خلق کی ابتدا کرتا ہے، پھر اس کا اعادہ کرتا ہے؟ یقیناً یہ (اعادہ تو) اللہ کے لئے آسان تر ہے، اُن سے کہو کہ زمین میں چلو پھرو اور دیکھو اس نے کس طرح خلق کی ابتدا کی ہے" (سورۃ العنکبوت ۲۹۔ رکوع ۳)

دوسرے بند کا پہلا شعر اور دوسرے شعر کا پہلا مصرعہ ہو بہو درج ذیل آیات کے ترجمان ہیں، اور ان آیات میں بھی "کھول آنکھ" کی باتیں کہی گئی ہیں :-

"کیا تم لوگ نہیں دیکھتے کہ اللہ نے زمین اور آسمان کی ساری چیزیں تمہارے لئے مسخر کر رکھی ہیں، اور اپنی کھلی اور چھپی نعمتیں تم پر تمام کر دی ہیں، اس پر حال یہ ہے کہ انسانوں میں سے کچھ لوگ ہیں جو اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں بغیر اس کے کہ ان کے پاس کوئی علم ہو، یا ہدایت، یا کوئی روشنی دکھانے والی کتاب"۔ (سورۃ لقمان ۳۱۔ رکوع ۳)

"کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اُس نے وہ سب کچھ تمہارے لئے مسخر کر رکھا ہے، جو زمین میں ہے، اور اُس نے کشتی کو قاعدے کا پابند بنایا ہے کہ وہ اُس کے حکم سے سمندر میں چلتی ہے۔ اور وہی آسمان کو اس طرح تھامے ہوئے ہے کہ اُس کے اذن کے بغیر وہ زمین پر نہیں گر سکتا"۔
(سورۃ الحج ۲۲۔ رکوع ۹)

"وہی تو ہے جس نے تمہارے لئے زمین کا فرش بچھایا ہے، آسمان کی چھت بنائی، اوپر سے پانی برسایا، اور اُس کے ذریعہ سے ہر طرح کی پیداوار نکال کر تمہارے لئے رزق بہم پہنچایا"۔ (سورۃ البقرہ ۔ ۲ ۔ رکوع ۳)

خدا نے آنکھیں کھول کر اپنی نشانیوں کو دیکھنے کی تاکید اس لئے کی ہے تاکہ انسان کو غور و فکر کے بعد یہ یقین ہو جائے کہ اتنی ساری چیزوں کا خالق صرف وہی وحدہٗ لاشریک ہی ہو سکتا ہے، اور دوسرے یہ کہ یہ چیزیں خدا نے عبث نہیں بنائی ہیں، انہی نکتوں کی ترجمانی اقبال نے "کھول آنکھ" میں کی ہے۔

ارشادِ ربانی ہے :-

"ہم نے اس آسمان اور زمین کو اور جو کچھ اُن میں ہے کچھ کھیل کے طور پر نہیں بنایا ہے، اگر ہم کوئی کھلونا بنانا چاہتے اور بس یہی کچھ ہمیں کرنا تھا تو اپنے ہی پاس سے کر لیتے"۔ (سورۃ الانبیاء ۲۱ ۔ رکوع ۲)

"اُس (خدا) نے آسمانوں کو پیدا کیا، بغیر ستونوں کے جو تم کو نظر آئیں۔ اس نے زمین میں پہاڑ جما دیئے تاکہ وہ تمہیں لے کر ڈھلک نہ جائے، اُس نے ہر طرح کے جانور زمین میں پھیلائے اور آسمان سے پانی برسایا اور زمین میں قسم قسم کی عمدہ چیزیں اُگا دیں، یہ تو ہے اللہ کی تخلیق"۔ (سورۃ لقمٰن ۔ ۳۱ ۔ رکوع ۲)

"اچھا، تو کیا انھوں نے کبھی اپنے اوپر آسمان کی طرف نہیں دیکھا؟ کس طرح ہم نے اسے بنایا اور آراستہ کیا، اور اُس میں کوئی رخنہ نہیں ہے، اور زمین کو ہم نے بچھایا اور اُس میں پہاڑ جمائے، اور اُس کے اندر ہر طرح کی خوش منظر نباتات اُگا دیں، یہ ساری چیزیں آنکھیں کھولنے اور سبق دینے والی ہیں ہر اُس بندے کے لئے جو (حق کی طرف)

رجوع کرنے والا ہو اور آسمان سے ہم نے برکت والا پانی نازل کیا، پھر اس سے باغ اور فصل کے غلے اور بلند و بالا کھجور کے درخت پیدا کر دیے جن پر پھلوں سے لدے ہوئے خوشے تہ بہ تہ لٹکتے ہیں۔ یہ انتظام ہے بندوں کو رزق دینے کا۔" (سورۃ ق۔ ۵۰۔ رکوع ۱)

اقبال نے اس نظم کے پہلے بند کے دوسرے شعر کا دوسرا مصرعہ ایام جدائی کے ستم دیکھ جفا دیکھ اس لیے کہا ہے، چونکہ خدا نے آدمؑ کو نافرمانی کی وجہ سے جنت سے نکالتے وقت یہ کہا تھا کہ

"اتر جاؤ، تم ایک دوسرے کے (یعنی آدم اور ابلیس) دشمن ہو، اور تمھارے لیے ایک خاص مدت تک زمین میں جائے قرار اور سامانِ زینت ہے۔" — اور فرمایا۔ وہیں تم کو جینا اور مرنا ہے، اور اس میں سے تم کو آخر کار نکالا جائے گا۔" (سورۃ الاعراف رکوع ۲)

یہی ہے ایام جدائی یعنی ایک خاص مدت تک زمین میں جائے قرار۔ اس مصرعہ میں اقبال نے درج ذیل آیات بھی ذہن نشین کرائی ہے کہ

"اور یہ دنیا کی زندگی کچھ نہیں ہے، مگر ایک کھیل اور دل کا بہلاوا۔ اصل زندگی کا گھر تو دار آخرت ہے۔ کاش یہ لوگ جانتے۔" (سورۃ العنکبوت۔ ۲۹۔ رکوع ۷)

اور جہاں تک "ایام جدائی" کے "ستم اور جفا" کا سوال ہے ستم یہ ہے کہ "وہیں تم کو جینا اور مرنا ہے۔" اور پھر یہ کہ "دنیا کی زندگی کچھ نہیں ہے، مگر ایک کھیل اور دل کا بہلاوا۔" اور "جفا" یہ ہے کہ "اصل زندگی کا گھر تو دار آخرت ہے، جہاں نامۂ اعمال کی پرکھ ہوگی۔

اس نظم کے دوسرے بند میں یہ مصرعہ ؏ "تھیں پیش نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں" درج ذیل آیات پر مبنی ہے :۔

"پھر یاد کرو اس موقع کو جب تمھارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ "میں سڑی ہوئی مٹی کے سوکھے گارے سے ایک بشر پیدا کر رہا ہوں، جب میں اس میں روح پھونک لوں تو تم سب

اس کے آگے سجدہ میں گر جانا۔ چنانچہ تمام فرشتوں نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے۔"

(سورۃ الحجر ۱۵۔ رکوع ۳)

"ہم نے تمھاری تخلیق کی ابتدا کی، پھر تمھاری صورت بنائی۔ پھر فرشتوں سے کہا آدم کو سجدہ کرو، اس حکم پر سب نے سجدہ کیا۔ مگر ابلیس سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا۔" (سورۃ الاعراف ۷۔ رکوع ۲)

ایسے تو پہلے دو بندوں میں جتنی باتیں کہی گئی ہیں وہ قرآن مجید میں بہت جگہ مذکور ہیں، مگر سورۃ النحل ۱۶ رکوع ۲۔ میں یہ ساری باتیں یکجا ملتی ہیں، جن کی ترجمانی ان پہلے دو بندوں میں کی گئی ہے :۔

"وہی ہے جس نے آسمان سے تمھارے لیے پانی برسایا جس سے تم خود بھی سیراب ہوتے ہو اور تمھارے جانوروں کے لئے بھی چارہ پیدا ہوتا ہے، وہ اس پانی کے ذریعے کھیتیاں اگاتا ہے، اور زیتون اور کھجور اور انگور اور طرح طرح کے دوسرے پھل پیدا کرتا ہے۔ اس میں ایک بڑی نشانی ہے، ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔

"اس نے تمھاری بھلائی کے لئے رات اور دن کو اور سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے، اور سب تارے بھی اسی کے حکم سے مسخر ہیں۔ اس میں بہت نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

"اور جو بہت سی رنگ برنگ کی چیزیں اس نے تمھارے لئے زمین میں پیدا کر رکھی ہیں" ان میں ضرور نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو سبق حاصل کرنے والے ہیں۔

"وہی ہے جس نے تمھارے لئے سمندر کو مسخر کر رکھا ہے تاکہ تم اس سے تر و تازہ گوشت لے کر کھاؤ، اور اس سے زینت کی وہ چیزیں نکالو جنھیں تم پہنا کرتے ہو، تم دیکھتے ہو کہ کشتی سمندر کا سینہ چیرتی ہوئی چلتی ہے، یہ سب کچھ اس لئے کہ تم اپنے رب کا

فضل تلاش کرو، اور اُس کے شکر گذار ہو۔

"اُس نے زمین میں پہاڑوں کی میخیں گاڑ دیں تاکہ زمین تم کو لے کر ڈھلک نہ جائے۔ اس نے دریا جاری کئے، اور قدرتی راستے بنائے تاکہ تم ہدایت پاؤ، اُس نے زمین میں راستہ بتانے والی علامتیں رکھ دیں، اور تاروں سے بھی لوگ ہدایت پاتے ہیں، پھر کیا وہ جو پیدا کرتا ہے، اور وہ جو کچھ بھی پیدا نہیں کرتے دونوں یکساں ہیں؟ کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے، اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو گن نہیں سکتے۔"

سورۃ النحل کی مندرجۂ بالا آیات اور اس سے قبل کی آیات میں خدا نے انسان کو اپنی آنکھیں کھول کر اس کی نشانیوں اور نعمتوں کو بار بار دیکھنے کی تاکید کی ہے، مگر اپنے ان سب ارشادات کی وجہیں بھی ہر جگہ یہ بتائی ہے کہ یہ سب نشانیاں اُن لوگوں کے لئے ہیں جو:۔

(۱) غور و فکر کرتے ہیں، (۲) جو عقل سے کام لیتے ہیں، (۳) جو سبق حاصل کرنا چاہتے ہیں، (۴) جو اپنے رب کا فضل تلاش کرنا چاہتے ہیں، (۵) ہدایت پانا چاہتے ہیں، (۶) اللہ کے خالقِ کائنات ہونے پر ایمان لانا چاہتے ہیں، (۷) آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔

اقبال نے بھی "کھول آنکھ" اور ٹیپ کے بندوں "بیتاب نہ ہو معرکۂ بیم و رجا دیکھ!" اور "آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ" میں انہی نکتوں کی ترجمانی کی ہے۔

اس نظم کے تیسرے بند میں اقبال یہ بتاتے ہیں کہ خدا نے انسان میں اتنی تخلیقی قوتیں ودیعت کی ہیں کہ اگر وہ اُن ساری چیزوں کو جن کا پہلے دو بندوں میں ذکر کیا ہے، غور و فکر کر کے اپنے قوتِ عمل سے تصرف میں لائے تو وہ دنیا پر فائز ہو سکتا ہے، اور دنیا اس کے اشاروں کو سمجھنے لگے گی کہ یہ انسان دنیا کو کس راہ پر لے چلنا چاہتا ہے۔ مگر اس کے لیے اقبال نے تعمیرِ خودی کی شرط رکھی ہے اور بغیر اس کی تعمیر کے یہ کام ممکن نہیں۔ خودی کی تعمیر کیوں کر ہوگی اس کی طرف اشارہ انھوں نے

اس تیسرے بند کے دوسرے شعر میں کیا ہے کہ "تخیل" یعنی "غور و فکر" اور "آوِرسا" یعنی "ذکر" سے کام لو، خودی کی تشکیل، تعمیر اور تزئین اسی "فکر" اور "ذکر" سے ہوتی ہے۔

"ذکر" قرآن میں یادِ الٰہی کا نام ہے۔ اس تیسرے بند میں اقبال نے درج ذیل آیات کی ترجمانی کی ہے، جس سے خودی کی تعمیر ہوتی ہے:۔

"زمین اور آسمانوں کی پیدائش میں اور رات اور دن کے باری باری سے آنے میں اُن ہوشمند لوگوں کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں، جو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹے ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں۔ اور آسمان اور زمین کی ساخت میں غور و فکر کرتے ہیں، (وہ بے اختیار بول اٹھتے ہیں)۔ "پروردگار! یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے، تو پاک ہے اس سے کہ عبث کام کرے۔ پس اے رب ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا لے...

"مالک! ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا جو ایمان کی طرف بلاتا تھا اور کہتا تھا کہ اپنے رب کو مانو۔ ہم نے اس کی دعوت قبول کر لی۔" جواب میں اُن کے رب نے فرمایا — "میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنے والا نہیں ہوں۔" (سورۃ آلِ عمران ۳، رکوع ۲۰)

"تم (نبی) یہ حکایات اُن کو سناتے رہو، شاید کہ یہ کچھ غور و فکر کریں، بڑی ہی بُری مثال ہے ایسے لوگوں کی جنھوں نے ہماری آیات (نشانیاں) کو جھٹلایا، اور وہ آپ اپنے ہی ظلم کرتے رہے ہیں ...... اور حقیقت یہ ہے کہ بہت سے جن اور انسان ایسے ہیں جن کو ہم نے جہنم ہی کے لئے پیدا کیا ہے، اُن کے پاس دل ہیں مگر وہ اُن سے سوچتے نہیں، اُن کے پاس آنکھیں ہیں، مگر وہ اُن سے دیکھتے نہیں، اُن کے پاس کان ہیں، مگر وہ اُن سے سنتے نہیں، وہ جانوروں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گزرے، یہ وہ لوگ ہیں جو غفلت میں کھوئے گئے ہیں۔ (سورۃ الاعراف ۷، رکوع ۲۲)

اس تیسرے بند کا یہ مصرعہ: "پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے"۔ اور اسکا ٹیپ کا بند: "تعمیرِ خودی کر اثرِ آہِ رسا دیکھ!" مندرجۂ بالا آیات کی ترجمانی تو کرتے ہی ہیں، مگر جب انسان کی خودی کا رخ "فکر و ذکر" کے ذریعے خدا کی طرف ہو جاتا ہے، تو اُس کی آہوں کے شرارے فلک تک پہنچنے لگتے ہیں، اور اُس کی سعی و عمل میں خدا اُس کا راہ نما ہو جاتا ہے، اور یہی ہے خودی کا اثرِ آہِ رسا جو مندرجۂ بالا ابیات میں اس آیت سے ماخوذ ہے:۔

"میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنے والا نہیں ہوں"۔

اور جس شخص نے اپنی خودی کی تعمیر کر لی ہے، اُس کی آہوں کے شرارے فلک تک اس لئے پہنچتے ہیں چونکہ ارشادِ ربانی ہے۔

"جو لوگ ہماری خاطر مجاہدہ کریں گے انھیں ہم اپنے راستے دکھائیں گے۔ اور یقیناً اللہ نیکوکاروں کے ساتھ ہے۔ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ۔ (سورۃ العنکبوت ۲۹-رکوع ۷)

"بے شک راستہ بتانا ہمارے ذمہ ہے"۔ (سورۃ اللیل ۹۳ - رکوع ۱)

"وہ (خدا) اپنی طرف آنے کا راستہ اُسی کو دکھاتا ہے، جو اُس کی طرف رجوع کرے"۔

(سورۃ الشوریٰ ۴۲ - رکوع ۱)

اس نظم کے چوتھے بند کے پہلے شعر میں اقبال انسان کو اُس کی بے پناہ صلاحیتوں سے آگاہ کر رہے ہیں، جس کو بروئے کار لاکر وہ ایک تازہ جہاں پیدا کر سکتا ہے، اور اپنے "خونِ جگر" سے اسی دنیا میں ایسی جنت بنا سکتا ہے، جس کے سامنے خدا کا بخشا ہوا فردوس بھی شاید آنکھوں کو نہ جچے، مگر یہ سب صرف "کوششِ پیہم" ہی سے ممکن ہے، کیونکہ اسی کوششِ پیہم اور عمل کے تواتر سے انسان کو تخلیقی ارتقا کی منزلیں طے کرنی ہیں:۔

"اور یہ کہ انسان کے لئے کچھ نہیں ہے، مگر وہ جس کی اُس نے سعی کی۔ (وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى)۔ (سورۃ النجم ۵۳ - رکوع ۲)

شروع کے بندوں میں کائنات میں پھیلی ہوئی اتنی ساری چیزوں کے ذکر کے بعد اقبال نے چوتھے بند میں درج ذیل آیات کی ترجمانی کی ہے:۔

"واقعہ یہ ہے کہ یہ جو کچھ سروسامان بھی زمین پر ہے، اس کو ہم نے زمین کی زینت بنایا ہے تاکہ ان لوگوں کو آزمائیں کہ ان میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے"۔ (سورۃ الکہف ۱۸ - رکوع ۱)

اسی "کوششِ پیہم" کو اقبال نے "بانگِ درا" کی ایک غزل میں اس طرح نظم کیا ہے۔

سعیِ پیہم ہے ترازوئے کم و کیفِ حیات — تیری میزان ہے شمارِ سحر و شام ابھی

پانچویں اور آخری بند میں اقبال نے انسان کی خمیر کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ یہ کہ تو روزِ ازل سے ہی عشق کے دام میں پھنسا ہوا ہے یعنی خدا سے محبت تری سرشت میں داخل ہے، تو محنت کش ہے اس لیے کہ تو مشقتوں میں پیدا کیا گیا ہے، تو تقدیرِ جہاں کا راکب ہے، اور یہی خدا کی رضا ہے، اس بند کے پہلے شعر کا پہلا مصرعہ: "نالندہ ترے عود کا ہر تار ازل سے"

درج ذیل آیات کا ترجمان ہے:۔

"اور جو لوگ مومن ہیں اللہ کی محبت میں بہت شدید ہوتے ہیں۔ (سورۃ البقرہ ۲-رکوع ۲۰)

اسی شعر کا دوسرا مصرعہ: "تو جنسِ محبت کا خریدار ازل سے"! درج ذیل آیات پر مبنی ہے:۔

"حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومن سے ان کے نفس اور ان کے مال جنت کے بدلے خرید لیے ہیں، وہ اللہ ہی کی راہ میں لڑتے اور مارتے اور مرتے ہیں، ان سے (جنت کا وعدہ) اللہ کے ذمہ ایک پختہ وعدہ ہے، پس خوشیاں مناؤ اپنے اس سودے پر جو تم نے خدا سے چکا لیا ہے یہی سب بڑی کامیابی ہے"۔

"اللہ کی طرف بار بار پلٹنے والے اُس کی بندگی بجالانے، اس کی تعریف کے گن گانے والے، اس کی خاطر زمین میں گردش کرنے والے، اُس کے آگے رکوع اور سجود کرنے والے، نیکی کا حکم دینے والے بدی سے روکنے والے، اور اللہ کے حدود کی حفاظت کرنے والے (اس شان کے ہوتے ہیں، وہ مومن جو اللہ سے خرید و فروخت کا یہ معاملہ طے کرتے ہیں) اور اے نبیؐ، ان مومنوں کو خوشخبری دے دو"۔ (سورۃ التوبہ ۹۔ رکوع ۱۴)

اس "جنس محبت" پر ایک حدیث بھی درج ذیل ہے:۔

حضرت نعمان بن بشیرؓ کا بیان ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے:۔

تم مومنوں کو آپس کے رحم اور محبت اور ہمدردی کے معاملہ میں ایک جسم کی طرح پاؤ گے۔ (بخاریؒ و مسلمؒ)

یہ کہ انسان "محنت کش" ہے، اس آیت سے ماخوذ ہے:۔

درحقیقت ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے:۔ (سورۃ البلد۔ ۹۰۔ رکوع ۱)

اس بند کا ٹیپ کا بند:۔ "اے راکبِ تقدیرِ جہاں تیری رضا دیکھ!" درج ذیل آیات پر مبنی ہے:۔

"اللہ نے وعدہ فرمایا ہے، تم میں سے اُن لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ اُن کو اُسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا، جس طرح اُن سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے"۔ (سورۃ النور ۲۴۔ رکوع ۸)

"اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو۔ میری زمین وسیع ہے، پس تم میری بندگی بجالاؤ"

(سورۃ العنکبوت ۲۹۔ رکوع ۱)

اور جہاں تک تسلیم و رضا کا سوال ہے اقبال کا اشارہ درج ذیل آیات سے ہے:۔

"اے نفسِ مطمئن چل اپنے رب کی طرف اس حال میں کہ تو (اپنے انجام نیک سے) خوش اور اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ ہو۔ شامل ہو جا میرے (نیک) بندوں میں اور داخل ہو جا جنت میں"۔

(سورۃ الفجر ۸۹۔ رکوع ۱)

مکتوبِ پیرس

مولانا سید سلیمان ندوی قدس اللہ سرہٗ کی صد سالہ سالگرہ کی تقریب

پیرس ۱۴ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۵ھ دوشنبہ

مخدوم و محترم! السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

کئی ہفتے ہوئے عنایت نامہ مل گیا، اور سرفراز کیا تھا، "جشن سلیمانی" کی آخری معلوم تجویز کے انجام کے انتظار میں جواب میں تاخیر ہوئی۔ معاف فرمائیں۔

کیا ایسے جشن شرعاً جائز ہیں؟ آج کل کے بحران فکری میں بعض مسلمان اور تو اور خود جشن میلادِ نبوی کو بھی حرام قرار دے رہے ہیں، اور واحد استدلال یہ کہ رسول اکرمؐ نے اس کا حکم نہ دیا، (جس میں خلقِ عظیم ہو تو کیا اس کی تواضع اجازت دے سکتی ہے، کہ وہ ایسا حکم خود اپنے متعلق دے؟)، مگر یہ بھولے اس بات کو بھولتے ہیں کہ خود خدا نے اپنے حبیب کا یہ جشن شروع فرمایا، اور ہمیں اطلاع دی کہ "اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا"۔ اور مزید برآں خود رسول اکرمؐ کو، اور آپؐ کے واسطے سے مسلمانوں کو حکم دیا کہ "وَاَمَّا بِنِعْمَۃِ رَبِّکَ فَحَدِّثْ"

کیا اس سے بڑھ کر کوئی نعمتِ خداوندی ہو سکتی ہے کہ کسی امت، اور نوعِ انسانی کے کسی معاشرے میں کوئی نبی بھیجے؟

حدیث صحیح ہے کہ "العُلماء ورثۃ الانبیاء" اس تحدیث نعمت کا موضوع بننے کا استحقاق کسی نبی کے بعد سب سے پہلے علمائے امت کو حاصل ہو گا۔ اور تحدیث نعمت کے طریقے غیر محدود ہو سکتے ہیں۔

جشن سلیمانی عصرِ حاضر میں، خاص کر ہمالیہ تلے کے برِاعظم اور اردو زبان میں مرحوم سید سلیمان ندویؒ نے

دین اور علم کی اتنی خدمت کی ہے کہ اس کے مماثل کسی اور نے شاذ ہی کی، ان کے مستفیدین اور انکا احترام کرنے والے شکر گزار دیگر مقاموں کی طرح پاریس میں بھی بہ کثرت ہیں، کہتے ہیں کہ مرحوم نے ایک بار اس سرزمین فرنگ کو اپنی آمد سے شرف بھی بخشا تھا، یہ بھی معلوم ہوا کہ ڈیڑھ سو سال سے زیادہ عرصے سے جامعۂ پاریس میں اردو کی تعلیم کی کرسی قائم ہے، اور گارسیں دتاسی سے لے کر اب تک اس کا سلسلہ جاری ہے، (پاریس میں اردو کی کرسی کے قیام کا فرانسیسی فرمان شاہی مورخہ ۱۷ دسمبر ۱۸۳۰ء کا موجود ہے۔)

جشن صد سالہ | مولانا مرحوم کی ولادت دیسنہ میں، خاندانی روایات کے مطابق، جمعہ ۲۳ صفر ۱۳۰۲ھ کو ہوئی۔ اور ان کے دادا کی طرف ایک تاریخی قطعہ منسوب ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں۔ ؎

بگفتا کہ بے داد شد مصرعے
شدہ مہر تابان ز برج کمال
۱۳۰۲

اس کی معادل تاریخ نہ معلوم کس نے (سہواً) ۲۲ نومبر ۱۸۸۴ء بتائی اور وہ یہاں تک پھیلی کہ مرحوم کے مزار تک پر کندہ کرادی گئی۔

فرنگیوں نے دو تین سو سال سے تقابلی جدولیں شائع کرنی شروع کی ہیں، جن میں ہجری اور عیسوی معادل تاریخیں درج ہوتی، اور آسانی سے ڈھونڈھی جاسکتی ہیں، ایسی قدیم ترین کتاب لاطینی میں ہے، اور اب ہر بڑی فرنگی زبان میں موجود ہے، (اور اسی کی نقل عربی اور اردو اور شاید فارسی اور ترکی میں بھی) ہوئی اور ان ساری غلطیوں کی حامل جو فرنگی جدولوں میں ہیں۔

بات یہ ہے، کہ ان میں گزشتہ چودہ سو سال کے ہر مہینے کی رویت ہلال کو حساب کر کے معلوم کرنے کی جگہ ایک من گھڑت اصول فرض کر لیا ہے کہ محرم، ربیع الاول، جمادی الاولیٰ، رجب، رمضان اور ذی القعدہ ہمیشہ ہمیشہ تیسے ہوتے ہیں، اور صفر، ربیع الآخر، جمادی الآخرہ، شعبان اور شوال ہمیشہ انتیسے ہوتے ہیں، اور ذی الحجہ حسب حساب کبھی انتیسا اور کبھی تیسا ہوتا ہے۔

بچہ بچہ بھی جانتا ہے کہ یہ بالکل غلط ہے، رمضان مثلاً کبھی انتیسا ہوتا ہے تو کبھی تیسا، کبھی کئی کئی مہینے مسلسل انتیسے اور کبھی مسلسل کئی کئی مہینے تیسے بھی ہوتے ہیں،

ان حالات میں ان فرنگی جدولوں پر کامل اعتماد نہیں ہو سکتا، ایک، دو یا تین دن کا فرق ہو سکتا ہے، جیسا کہ ابھی نیچے مرحوم کی تاریخ وفات کے سلسلہ میں عرض ہوگا۔

بہر حال ان فرنگی جدولوں کے مطابق جمعہ ۲۳ صفر ۱۳۰۲ھ کی معادل تاریخ جمعہ ۱۲ دسمبر ۱۸۸۴ء ہے (۲۲ نومبر نہیں)، تاریخ وفات اتوار ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء کو ہوئی جو پاکستانی رویت ہلال کے مطابق ۱۴ ربیع الاول ۱۳۷۳ھ تھی، (لیکن فرنگی جدولوں کے مطابق اتوار کو ۱۵ ربیع الاول تھی، اور ۱۴ کو سنیچر کا دن تھا)

افسوس ہے کہ ۱۹۸۴ء میں کسی کو خیال نہ آیا کہ مرحوم کی ولادت کا صد سالہ جشن منایا جائے اب فرنگی صدی کے سوا چارہ نہیں۔

پاریس کی تقریبیں | حکومت فرانس نے ابھی کوئی سال ڈیڑھ سال سے سیاسی مصلحت کے تحت سرکاری ٹیلی وژن میں ہر اتوار کی صبح کو نو سے سوا نو بجے تک پندرہ منٹ مستقل طور پر "اسلامی اشاعت" (Emission islamique) کے لئے دے رکھے ہیں، اس کا مہتمم مستشرق پروفیسر ژاک برک (Jaques Berque) کے سپرد ہے، جو صدر جمہوریہ موسیو میتیراں کے پرانے شخصی دوست ہیں، اس کی سربراہی کے لیے مقامی مسلمانوں کی ایک کمیٹی قائم کی گئی ہے، میں نے اس کے صدر اور معتمد سے عرض کیا کہ ایک اشاعت مرحوم سید سلیمانؒ کے لیے مختص کی جائے، انھیں کچھ تفصیلیں بھی دیں کہ مرحوم کا علمی کارنامہ کیا ہے، اور ٹیلی وژن کی ضرورتوں سے مرحوم کے اور مرحوم کے مزار کے کچھ فوٹو (جو مولانا غلام محمد صاحب کراچی، کا تحفہ تھے) نیز مرحوم کی چند کتابوں کے سرورق کے عکوس بھی مہیا کئے، یہ عرض قبول کی گئی، اور اتوار ۲۵ نومبر ۱۹۸۴ء کو یہ اشاعت عمل میں آئی، اس میں

مطلوبہ دو لیکچروں میں ایک پروفیسر عبدالغفور فرہادی رواں صاحب (سابق وزیر و سفیر افغانستان) تھے، اور دوسرے سالار الدین محمد صاحب تھے، جو کتب خانہ السنۂ شرقیہ میں ایک فہرست نگار ہیں، اور کاریکال کے باشندے۔

۲۔ اسی دن دوپہر کو پاریس کے محلۂ اِستالن گراڈ کی مسجد میں بھی یہ جشن ہوا، جو ۳۹ شارع طنجہ پر واقع ہے، اور وسعت کے لحاظ سے یہاں کی سب سے بڑی مسجد ہے کہ کوئی تین ہزار آدمی بہ یک وقت نماز پڑھ سکتے ہیں، پاریس میں رابطۃ الطلاب الاسلامیین ایک انجمن ہے، جو تیس اکتیس سال سے قائم ہے، وہ ہر اتوار کو ایک لکچر کراتی ہے عربی میں ہو تو اس کا فی الفور فرانسیسی ترجمہ ہوتا ہے، فرانسیسی میں ہو تو عربی ترجمہ، قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند، اولاً قرآن خوانی اور فاتحہ ہوئی، پھر میں نے تقریباً دو گھنٹے اپنے معلومات فرانسیسی میں برجستہ عرض کئے، جن کا آدھا وقت عربی ترجمے میں صرف ہوا، اس کے بعد حاضرین نے جو بہت متاثر تھے، سوالات بھی کئے، اور توضیحیں چاہیں۔

۳۔ اس کے چند دن بعد دسمبر کے آغاز میں، اس کے لئے یہاں کی "ترکی" مسجد میں ہندی پاکستانی جلسہ ہوا، انگلستان میں عالمگیر اسلامی مشن نامی ایک ادارہ قائم کیا گیا ہے، اس کی ایک شاخ پاریس میں بھی دو چار سال سے قائم ہے، ان احباب کو یاد دلانا پڑا کہ سلیمان ندویؒ کون تھے، کب تھے، پھر ان کی فرمائش کی تعمیل کرنی پڑی، اولاً آدھ گھنٹہ حاضرین نے قرآن خوانی کی، پھر وہاں اردو میں اس موضوع پر لکچر ہوا۔

۴۔ اب پاریس میں ایک جگہ تیرہ یونیورسٹیاں قائم ہو گئی ہیں، ان میں سے ایک میں اردو کے استاد محمد عبدالماجد صاحب ہیں، انھوں نے جامعہ میں اس تقریب کا اہتمام کیا اور ۲۲ دسمبر کو ٹھیک صد سالہ سالگرہ کے دن ان کے شعبے میں فرانسیسی تقریریں ہوئیں، خود ان کی بھی اور ایک میری بھی، میں نے خاص کر اس پر زور دیا کہ مرحوم کے ہاں اپج بہت تھی، اور نئے نئے نادر موضوعوں پہ

کام کرتے تھے، مثلاً قدیم مسلمانوں کے ہاں اندھوں کا خط، جغرافیہ قرآن، تحریری تدوین حدیث، انجیل برنابا، نظریۂ ارتقا، ملک حبشہ میں ایک اسلامی مملکت، روس میں اسلامیات کی تعلیم، جاپان کا نظام تعلیم وغیرہ وغیرہ، زمانہ طالب علمی میں سیرت عائشہؓ لکھی جو بعد میں اب تک بلا ترمیم شائع ہوتی رہی ہے، اور بڑی مستند کتاب ہے، انھیں اسلامی دستور سے بھی دلچسپی تھی، مسئلہ خلافت کے سلسلے میں ہندوستانی وفد میں لندن بھی گئے، اور مکۂ معظمہ کی کانفرنس میں بھی شریک رہے، وہ عربی کے خطیب تھے، انگریزی ہی نہیں عبرانی بھی جانتے تھے، کتابیں دس بیس لکھیں تو مقالے سیکڑوں۔ وسعتِ قلب کا یہ عالم تھا کہ حنفی تھے، لیکن سوانح عمری لکھی تو امام مالکؒ کی۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ سیرت النبیؐ کی پانچ جلدیں ہیں، جو اردو زبان کا مایہ ناز ہیں، ہنوز ناتمام ہی تھی کہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔

۵۔ پاریس میں جامعات کے ساتھ، ایک مستقل ادارہ ہے، "بین الممالک معاملات کی تحقیق"۔ اس میں معلومات اور دستاویزیں، جمع کی جاتی ہیں، اس نے بھی مرحوم سے دلچسپی لی ہے۔ اور توقع ہے کہ آئندہ چند ہفتوں یا مہینوں میں اس کے ہاں بھی معتاد لکچروں میں (جو ہر پیر کو ہوتے ہیں۔) ایک سید صاحب مرحوم کی تقریب کے لئے بھی ہوگا۔ واللہ المستعان۔

(ڈاکٹر) محمد حمید اللہ

مولانا محمد علیؒ

مصنف اس کتاب کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ ملک کے سیاسی لیڈروں میں سب سے زیادہ میں مولانا محمد علیؒ سے متاثر ہوا، میں اپنی اسوقت کی زندگی تک بہت سے سیاسی رہنماؤں کو دیکھا مگر مولانا محمد علی میں جو غیر معمولی خوبیاں تھیں، ان میں کسی کو بھی ان کا ہمسر نہیں پایا، محمد علی پر یہ کتاب ان کے انہی عقیدت مندانہ تاثرات اور سرشارانہ کیفیات کی آئینہ دار ہے، ان کی کوئی مستقل سوانح عمری نہیں ہے۔ (زیر طبع)

مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن

مطبوعات جدیدہ

آئینۂ حرم :- مرتبہ جناب محی الدین قادری رزاقی، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۱۹۶ مجلد مع نقشے، قیمت ۲۵ روپیے۔ پتہ۔ رزاقیہ کتاب گھر ۴/۱۴۲۹۔ لے لدرانگر لکھنؤ

یہ کتاب مسجد نبوی اور مدینہ منورہ کے آثار ومشاہد کے متعلق ایک مفید ومستند دستاویز ہے جو چار حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش، بعثت اور مکی دور کے مختصر حالات تحریر کرنے کے بعد بیعت عقبہ، ہجرت اور مسجد نبوی کی تعمیر کا مفصل حال درج ہے، آپ کے عہد مبارک نیز خلفائے راشدینؓ، اموی وعباسی خلفاء اور عثمانی ترکوں کے زمانہ میں مسجد نبویؐ میں جو توسیع واضافہ ہوتا رہا ہے، اس کی مفصل کیفیت بیان کی گئی ہے، اس میں مسجد نبوی سے متعلقہ عمارتوں، آپ کے منبر، مصلی، مختلف اسطوانوں، روضۂ اقدس، حضرات شیخینؓ کی آرامگاہوں، گنبد خضراء، امہات المومنین کے حجروں، ریاض الجنۃ اور اصحاب صفہ کے چبوترہ کے علاوہ مسجد قبا اور مسجد ضرار کے بارہ میں بھی ضروری معلومات پیش کئے گئے ہیں اور ضمناً سیرت نبویؐ کے بعض واقعات کا بھی تذکرہ آگیا ہے، جیسے اذان، تحویل قبلہ، روزہ، زکوٰۃ اور حج کی فرضیت، شراب کی حرمت اور پردہ کے احکام، غزوات، صلح حدیبیہ، فتح مکہ اور حجۃ الوداع کے واقعات وغیرہ، ہر عمارت کے نقشے بھی دئے ہیں، اور مسجد نبویؐ کے عہد بعہد اضافوں کو ظاہر کرنے کے لیے کئی نقشے دئے ہیں، دوسرے حصہ میں مدینہ طیبہ میں حاضری کے آداب، روضۂ اطہر اور مسجد نبویؐ کی زیارت کی اہمیت، مدینہ میں داخلہ کی دعائیں لکھی ہیں، اور حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور شیخینؓ کی جناب میں پیش کئے جانے والے سلام کا ذکر ہے ایک حصہ جنت البقیع کے ذکر کے لیے مخصوص ہے، اس میں اس کے آثار، اس کے حدود اور داخلہ کے اوقات

بتائے ہیں، اور جنت البقیع میں دفن صحابہ وتابعین اور ائمہ کے سلام کا تذکرہ کیا ہے، چوتھے حصہ میں مدینہ منورہ اور اس کے اطراف کی مشہور ومتبرک جگہوں کا ذکر ہے، اسی حصہ میں سقیفہ بنی ساعدہ، جبل رماۃ، احد کے میدان اور پہاڑ اور بدر وغیرہ کے علاوہ بعض کنووں، باغوں، متعدد مسجدوں، شاہی محل، مدینہ یونیورسٹی، دارالقضا، اسپتال، مدینہ کے بازار، ریلوے اسٹیشن، عمارت حکمت سعودی حکومت، اور مولانا عبد الباقی فرنگی محلی کے کتب خانوں کے بارہ میں مفید معلومات قلمبند کئے گئے ہیں اور مدینہ منورہ کی کھجوروں، پھلوں، ترکاریوں اور پانی وغیرہ کی عجیب خصوصیات اور فائدے تحریر کیے ہیں، بالکل آخر میں، استنبول کے ایک پمفلٹ کے حوالہ سے انیس متبرک یادگاروں کی تصویریں درج ہیں، ان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور بعض خلفائے راشدینؓ کی تلواریں، احد میں شہید دندان مبارک، مہر نبوت اور مصحف عثمانی وغیرہ کئی اہم تبرکات کی تصویریں ہیں، اس کتاب سے مصنف کے دینی جذبہ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ عقیدت ومحبت کا اظہار ہوتا ہے، انھوں نے بڑی محنت وجستجو سے مدینہ طیبہ اور حرم نبوی کے متعلق بہت سے مفید، ضروری اور مستند معلومات تحریر کئے ہیں اس کتاب کی خاص خوبی عمارتوں کے مفصل نقشے ہیں، اس اعتبار سے مدینہ منورہ کے زائرین کو اس کا ضرور مطالعہ کرنا چاہئے، حضرت سلمان فارسیؓ کے طویل العمر ہونے کی روایتیں بے بنیاد ہیں لیکن مصنف نے ان کو معتبر سمجھ لیا ہے، (ص ۱۰۰) اسطوانہ کا املا، استوانہ لکھا ہے، اور عثمان بن مظعون کو عثمان بن مضعون لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے۔

دین اسلام اور اولین مسلمانوں کی دو متضاد تصویریں : مرتبہ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۷۰ قیمت چھ روپیے، پتہ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، پوسٹ بکس ۱۱۹ ندوۃ العلماء لکھنؤ،

اس کتاب میں ہندوستان کے مشہور داعی ومصلح مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے اسلام کے اولین دور

اور قرن اول کے مسلمانوں کی دو متضاد تصویریں کھینچی ہیں، انھوں نے عالمگیر اور دائمی دین کے حامل پیغمبر کی چار خصوصیات
اور شرطیں بیان کر کے تاریخ، واقعات، حقائق اور غیر مسلم فضلا کی شہادتوں سے ثابت کیا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم
و تربیت اور صحبت کی غیر معمولی تاثیر، انقلاب انگیزی و قلب ماہیت کی قوت اور آدم گری و آدم سازی کی معجزانہ شان کی
وجہ سے ایک مثالی و معیاری معاشرہ وجود میں آگیا اور روئے زمین پر افراد انسانی کا کوئی مجموعہ اور نسل انسانی کا کوئی
گروہ صحابہ کرام سے بہتر سیرت و کردار کا حامل نہیں گذرا، دوسرے آپ نے بانیان سلطنت اور عام کشور کشاؤں کی طرح
خاندانی و موروثی سلطنت کی بنیاد رکھنے اور اپنے ذاتی و خاندانی مفاد کا تحفظ کرنے کے بجائے الاقرب فالاقرب کا
کوئی معاملہ ہی نہیں رکھا، خطرے کی جگہوں پر اپنے کو اور اپنے عزیزوں کو آگے رکھا، اور نفع و آرام کے موقع پر اپنے کو اور انھیں
پیچھے کر دیا، آپ کی تعلیم نے انسان کی ذاتی سعی و صلاحیت کو اصل اور سعادت و ترقی کا دار و مدار قرار دیا، تیسرے آپ کا
لایا ہوا صحیفہ ہر قسم کی دستبرد، تغیر و تبدل اور تحریف سے پاک ہے، جس کی شہادت غیر مسلموں نے بھی دی ہے، چوتھے آپ کی
ذات مرکز ہدایت، سرچشمہ قیادت اور امت کی قلبی وابستگی اور ذہنی سپردگی کا محور رہی، اور اس آفتاب عالمتاب کے سامنے اقطاب
و ابدال، کملا و فضلائے اہل بیت و راثت تھے، اسلام اور قرن اول کے مسلمانوں کی اس تصویر یا تعبیر کو وہ اہلسنت
والجماعت کا اجماعی عقیدہ بتاتے ہیں، اور اسکے بالکل متوازی فرقہ امامیہ اثنا عشریہ کے حوالہ سے اسلام کے ابتدائی دور
اور صحابہ کرام کی نہایت کریہہ اور گھناؤنی تصویر کشی کی ہے اور نبی کا مقصد عام فرمانرواؤں کی طرح خاندانی حکومت
کی تاسیس قرار دیا ہے، اور اس فرقہ کا یہ خیال بھی بتایا ہے کہ قرآن مجید محرف ہو چکا ہے، اور وہ ائمہ کو معصوم اور
نبی ہی کی طرح مفترض الطاعۃ سمجھتا ہے، مصنف نے یہ تصویر قدیم شیعی علماء کی کتابوں کے علاوہ دور حاضر کے
ایرانی انقلاب اور اسلامی حکومت کے داعی آیت اللہ خمینی کی کتب و رسائل کی مدد سے تیار کی ہے، اور آخر میں
عقل سلیم اور انصاف پر اسکا فیصلہ چھوڑ دیا ہے کہ کون سی تصویر زیادہ موزوں اور قابل قبول ہو سکتی ہے،
امید ہے کہ اصحاب علم و نظر مولانا کے نکات بحث پر سنجیدگی سے غور و فکر کر کے صحیح و صائب فیصلہ کریں گے اور اسلام کی
صحیح اور اصلی تصویر کو دھندلی ہونے سے بچائیں گے۔

فہرست مشترک نسخہ ہائے خطی فارسی پاکستان (اول) — مرتبہ جناب احمد منزوی صاحب تقطیع کلاں، کاغذ عمدہ، کتابت طباعت، صفحات ۹۰۵ مجلد، قیمت
ناشر مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، خانہ ۵ خیابان مسجد، ف ۶/۳ اسلام آباد۔

پاکستان کے کتبخانوں میں فارسی کے جو مخطوطات موجود ہیں، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان نے انکی فہرست شائع کرنے کا
پروگرام بنایا ہے، یہ اس سلسلہ کی پہلی جلد ہے، اس میں پاکستان کے متعدد کتبخانوں کے مختلف فنون کے ۳۰۰۵ مخطوطات کا ذکر مندرجہ ذیل تین
قسموں میں کیا گیا ہے، (۱) علوم قرآنی (تفسیر، تجوید، درباره قرآن) (۲) علوم ریاضی (ستاره شناسی، اختر بینی، علوم غریبہ (رمل جفر) (۳) علوم تجربی
یعنی طبیعیات (جہان شناسی، کان شناسی، جواہر شناسی، کشاورزی، جانور شناسی، خواص اشیاء، صنعت فیزیک، آشپزی، شیرینی
پزی، فراست، قیافہ شناسی، جستن اندلہا، تیر تفنگی (طب، کیمیا، چند دانشی) کتابوں کے نام حروف تہجی کی ترتیب سے درج ہیں اور تعارف
میں مخطوطات اور انکے مصنفین کے نام اور سن تصنیف کی صراحت کی ہے اور شروع کی عبارت اور ابواب و فصول کا ذکر بھی ہے پھر
کتابوں اور مصنفین کے بارہ میں جن دوسری کتابوں میں معلومات درج ہیں ان کی نشاندہی کی ہے، کتابوں کے ناموں اور
سن تصنیف کے فرق و اختلاف کی تصریح بھی کی ہے، پاکستان کے ان شہروں کے نام لکھے ہیں جہاں کے کتبخانوں میں یہ مخطوطات
موجود ہیں، خط کی قسم، کاتب کے نام، تاریخ کتابت اور صفحوں کی تعداد بھی تحریر کی ہے، اگر کسی کتاب کے متعدد نسخے ہیں تو ان کا ذکر تاریخی
ترتیب کے اعتبار سے کیا ہے، جناب احمد منزوی پاکستان میں فہرست نگاری اور کتاب شناسی کے ماہر خیال کئے جاتے ہیں، وہ پہلے بھی
مخطوطات کی فہرستیں مرتب کر چکے ہیں، ان کا نام ہی زیر نظر فہرست کی خوبی کی ضمانت ہے، انھوں نے مقدمہ میں اس محنت شاقہ کا
ذکر کیا ہے، جو اس فہرست کی ترتیب و تالیف میں انکو اٹھانی پڑی ہے اور ان امور کی صراحت بھی کی ہے جن کو اس میں مدنظر رکھا گیا ہے
ابتدا میں مرکز تحقیقات کے ڈائرکٹر نے قرآن مجید کی روشنی میں قرات، کتاب، قلم، کلمہ اور کلام کی اہمیت بڑے اچھے انداز میں واضح کی ہے،
اور فہرست نگاری کی جانب قدیم علمائے اسلام کے اعتنا کا ذکر بھی کیا ہے، کتاب کی کئی فہرستیں بھی دی گئی ہیں، ایک ایک فہرست تینوں
فنون کی کتابوں کے آخر میں مولفین کے ناموں کے لحاظ سے درج ہے اور آخر کی دو فہرستوں میں ایک حروف تہجی کے مطابق
مخطوطات کے ناموں کے اعتبار سے ہے اور دوسری متن کے حصہ کتاب شناسی میں وارد ناموں کی ہے، مگر اس جلد میں قرآنی کتابوں
کے ساتھ احادیث و فقہ کے بجائے ریاضیات و طبیعیات کی کتابوں کا ذکر بے جوڑ سا معلوم ہوتا ہے۔

قومی یکجہتی اور اسلام:- مرتبہ ڈاکٹر غیاث الدین ندوی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت معمولی، صفحات ۱۲۸،
مجلد مع گردپوش، قیمت بارہ روپیہ، عقب پولس چوکی، مرح گنج، سیتاپور روڈ، لکھنؤ۔

ہندوستان ایک نہایت وسیع و عریض ملک ہے، اس میں مختلف قومیں اور ملتیں آباد ہیں، اور اس کے مختلف علاقوں میں نسلی، مذہبی، لسانی اور جغرافیائی حیثیت سے بڑا فرق و اختلاف بھی ہے، اسلئے اس ملک میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور مختلف قوموں میں اتحاد و یکجہتی کا مسئلہ بڑا اہم ہے، مصنف نے اسکی اہمیت کو واضح کرنے کے بعد قوم، قومیت اور یکجہتی کا مفہوم بیان کیا ہے اور انکے متعلق اسلامی تصور اور نقطۂ نظر پیش کیا ہے، انھوں نے مختلف طبقہ و نسل کے لوگوں میں یکجہتی اور اتحاد کو فروغ دینے کے متعلق اسلام کی تعلیمات اور کوششوں کا ذکر بھی کیا ہے، اور اس سلسلہ میں مسلمانوں کی ذمہ داری اور کسی ملک میں محکوم مسلمانوں کے فرائض بھی بتائے ہیں، مصنف نے اتحاد و یکجہتی کے اس مفہوم کی تردید کی ہے، جس کے نتیجہ میں اس ملک میں آباد تمام لوگوں کو ایک ہی مذہب اختیار کرنے اور ایک ہی زبان کو اپنا لینے یا بالفاظ دیگر "قومی دھارے" میں شامل ہونے کی دعوت دی جاتی ہے، ان کے خیال میں ہر آدمی اپنی قومی، ملی اور مذہبی خصوصیات پر قائم رہنے کے باوجود ملک کا وفادار ہو سکتا ہے اور قومی یکجہتی کا نمونہ پیش کر سکتا ہے، اس ضمن میں ہندوستانی مسلمانوں کی گزشتہ تاریخ سے اس کی متعدد مثالیں پیش کی گئی ہیں۔

ہمارے اسلاف: مرتبہ مولوی عبد العلی فاروقی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۱۵۲، قیمت آٹھ روپیے، پتہ مکتبۃ البدر، دار العلوم فاروقیہ، کاکوری، لکھنؤ۔

اس مختصر کتاب میں تیس صحابۂ کرامؓ کے مختصر حالات و سوانح درج ہیں، شروع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر جمیل بھی ہے، اس کے بعد پہلے عشرہ مبشرہ اور آخر میں دوسرے جلیل القدر صحابہ کرام کا تذکرہ ہے، مصنف کو اعتراف ہے کہ اس موضوع پر ضخیم کتابیں تصنیف کی جا چکی ہیں، جن کے مطالعہ کے لئے کافی وقت درکار ہے، اس لئے انھوں نے ان مشہور اصحاب کی سیرت کو مختصر طور پر بیان کیا ہے، جن کا ذکر ہر موقع پر آتا ہے، اور چونکہ یہ کتاب کم پڑھے لکھے لوگوں اور طالب علموں کیلئے لکھی گئی ہے اسلئے اسکی زبان سہل اور آسان ہے، صحابۂ کرام کی سیرت مقدسہ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ کا جزو اور پرتو ہے، اس لئے ان کا تذکرہ لکھنا ایک بڑی سعادت ہے، یہ کتاب ملا کی کتابوں خلفائے راشدین اور مہاجرین وغیرہ کی مدد سے لکھی گئی ہے، جن کے کہیں کہیں حواشی میں صفحات کی تعیین اور مصنفین کے ناموں کی صراحت کے بغیر حوالے بھی دیئے ہیں، مگر دیباچہ میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے، اگر صحابہ کرام کے اخلاق و سیرت کے دلکش نمونے اور موثر واقعات زندگی پیش کرنے کا زیادہ اہتمام کیا گیا ہوتا تو کتاب اپنے مقصد کے لحاظ سے زیادہ مفید اور کامیاب ہوتی۔

"ض" م

جلد ۱۳۵　ماہ رجب المرجب ۱۴۰۵ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۸۵ء　عدد ۴

مضامین